QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الشوریٰ

(۴۲)

QuranUrdu.com

الشُّوریٰ

نام آیت ۳۸ کے فقرے وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں لفظِ شُوریٰ آیا ہے۔

زمانۂ نُزُول کسی معتبر رِوایَت سے معلوم نہیں ہوسکا ہے، لیکن اس کے مضمون پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ حٰم السجدہ کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی، کیونکہ یہ ایک طرح سے بالکل اُس کا تَتِمّہ نظر آتی ہے۔ اِس کیفیت کو ہر وہ شخص خود محسوس کرے گا جو پہلے سورۂ حٰم السجدہ کو بغور پڑھے اور پھر اِس سورہ کی تلاوت کرے۔ وہ دیکھے گا کہ اُس سورت میں سردارانِ قریش کی اندھی بہری مخالَفت پر بڑی کاری ضربیں لگائی گئی تھیں، تاکہ مکۂ معظّمہ اور اس کے گردوپیش کے علاقے میں جس کسی کے اندر بھی اَخلاق، شرافت اور معقولیت کی کوئی حِس باقی ہو، وہ جان لے کہ قوم کے بڑے لوگ کس قدر بے جا طریقے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالَفت کر رہے ہیں، اور ان کے مقابلے میں آپؐ کی بات کتنی سنجیدہ، آپؐ کا مَوقِف کتنا معقول اور آپؐ کا رَوِیّہ کیسا شریفانہ ہے۔ اُس تنبیہ کے معاً بعد یہ سورت نازل کی گئی جس نے تفہیم کا حق ادا کر دیا اور ایسے دل نشین انداز میں دعوتِ محمدؐی کی حقیقت سمجھائی جس کا اثر قبول نہ کرنا کسی ایسے شخص کے بس میں نہ تھا جو حق پسندی کا کچھ بھی مادّہ اپنے اندر رکھتا ہو اور جاہلیت کی گمراہیوں کے عشق میں بالکل اندھا نہ ہو چکا ہو۔

موضوع اور مضمون بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ ہمارے نبی کی پیش کردہ باتوں پر یہ کیا چہ میگوئیاں کرتے پھر رہے ہو۔ یہ باتیں کوئی نئی اور نرالی نہیں ہیں، نہ یہی کوئی نادر واقعہ ہے جو تاریخ میں پہلی ہی مرتبہ پیش آیا ہو کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے وحی آئے اور اسے بنی نوعِ انسان کی رہنمائی کے لیے ہِدایات دی جائیں۔ ایسی ہی وحی، اِسی طرح کی ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے انبیا علیہم السلام پر پَے در پَے بھیجتا رہا ہے۔ اور نرالی، اچنبھے کے قابل بات یہ نہیں ہے کہ آسمان و زمین کے مالک کو معبُود اور حاکم مانا جائے، بلکہ یہ ہے کہ اس کے بندے ہو کر، اس کی خدائی میں رہتے ہوئے کسی دوسرے کی خداوندی تسلیم کی جائے۔ تم توحید پیش کرنے والے پر بگڑ رہے ہو، حالانکہ مالکِ کائنات کے ساتھ جو شرک تم کر رہے ہو، وہ ایسا جرمِ عظیم ہے کہ آسمان اُس پر پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں۔ تمھاری اس جسارت پر فرشتے حیران ہیں اور ہر وقت ڈر رہے ہیں کہ نہ معلوم کب تم پر خدا کا غضب ٹوٹ پڑے۔

اس کے بعد لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ نبوت پر کسی شخص کا مقرر کیا جانا، اور اس شخص کا اپنے آپ کو نبی کی

QuranUrdu.com

حیثیت سے پیش کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ خَلقِ خدا کی قسمتوں کا مالک بنا دیا گیا ہے اور اسی دعوے کے ساتھ وہ میدان میں آیا ہے۔ قسمتیں تو اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ نبی صرف غافلوں کو چونکانے اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتانے آیا ہے۔ اُس کی بات نہ ماننے والوں کا محاسبہ کرنا اور اُنھیں عذاب دینا یا نہ دینا اللہ کا اپنا کام ہے۔ یہ کام نبی کے سُپرد نہیں کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس غلط فہمی کو اپنے دماغ سے نکال دو کہ نبی اُس طرح کے کسی دعوے کے ساتھ آیا ہے جیسے دعوے تمھارے ہاں کے نام نہاد مذہبی پیشوا اور پیر فقیر کیا کرتے ہیں کہ جو ان کی بات نہ مانے گا، یا اُن کی شان میں گستاخی کرے گا، وہ اسے جلا کر بھسم کر دیں گے۔ اسی سلسلے میں لوگوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نبی تمھاری بدخواہی کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ تو ایک خیر خواہ ہے جو تمھیں خبردار کر رہا ہے کہ جس راہ پر تم جا رہے ہو اس میں تمھاری اپنی تباہی ہے۔

پھر اس مسئلے کی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ اللہ نے سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر راست رَو کیوں نہ بنا دیا، اور یہ مجالِ اختلاف کیوں رکھی جس کی وجہ سے لوگ فکر و عمل کے ہر اُلٹے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ بتایا گیا کہ اسی چیز کی بدولت تو یہ امکان پیدا ہوا ہے کہ انسان اللہ کی اُس رحمتِ خاص کو پا سکے جو دوسری بے اختیار مخلوقات کے لیے نہیں ہے، بلکہ صرف اُس ذی اختیار مخلوق کے لیے ہے جو جِبلّی طور پر نہیں، شُعوری طور پر اپنے اختیار سے اللہ کو اپنا ولی (patron,guardian) بنائے۔ یہ رَوِش جو انسان اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سہارا دے کر، اس کی رہنمائی کر کے، اسے حسنِ عمل کی توفیق دے کر، اپنی رحمتِ خاص میں داخل کر لیتا ہے۔ اور جو انسان اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اُن کو ولی بناتا ہے جو درحقیقت ولی نہیں ہیں اور نہیں ہو سکتے، وہ اس رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کا اور ساری مخلوقات کا ولی حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ دوسرے نہ حقیقت میں ولی ہیں، نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ وِلایَت کا حق ادا کر سکیں۔ انسان کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے کہ وہ اپنے لیے اپنے اختیار سے ولی کا انتخاب کرنے میں غَلَطی نہ کرے، اور اُسی کو اپنا ولی بنائے جو درحقیقت ولی ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جس دین کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں، وہ حقیقت میں ہے کیا:

اُس کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ کائنات اور انسان کا خالق، مالک اور ولیِ حقیقی ہے، اس لیے وہی انسان کا حاکم بھی ہے، اور اسی کا یہ حق ہے کہ انسان کو دین اور شریعت (اعتقاد و عمل کا نظام) دے اور انسانی اختلافات کا فیصلہ کر کے بتائے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا۔ دوسری کسی ہستی کو انسان کے لیے شارع (lawgiver) بننے کا سرے سے حق ہی نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر، فطری حاکمیت کی طرح تشریعی حاکمیت بھی اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان یا کوئی غیر اللہ اس حاکمیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کوئی شخص اللہ کی اِس حاکمیت کو نہیں مانتا تو اس کا اللہ کی محض نظری حاکمیت کو ماننا لاحاصل ہے۔

QuranUrdu.com

اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا سے انسان کے لیے ایک دین مقرر کیا ہے۔

وہ ایک ہی دین تھا جو ہر زمانے میں تمام انبیاؑ کو دیا جاتا رہا۔ کوئی نبی بھی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی نہیں تھا۔ وہی ایک دین اوّل روز سے نسلِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا رہا ہے، اور سارے انبیاؑ اُسی کے پیَرو اور داعی رہے ہیں۔

وہ دین کبھی محض مان کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں بھیجا گیا، بلکہ ہمیشہ اس غرض کے لیے بھیجا گیا ہے کہ زمین پر وہی قائم اور رائج اور نافذ ہو، اور اللہ کے ملک میں اللہ کے دین کے سوا کسی اور کے ساختہ و پرداختہ دین کا سکّہ نہ چلے۔ انبیا علیہم السلام اس دین کی محض تبلیغ پر نہیں بلکہ اُسے قائم کرنے کی خدمت پر مامور کیے گئے تھے۔

نوعِ انسانی کا اصل دین یہی تھا، مگر انبیاؑ کے بعد ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ خود غرض لوگ اس کے اندر اپنی خود پسندی، خود رائی اور خود نُمائی کے باعث اپنے مفاد کی خاطر تفَرِقے برپا کر کر کے نئے نئے مذہب نکالتے رہے۔ دنیا میں یہ جتنے بھی مختلف مذہب پائے جاتے ہیں، سب اُسی ایک دین کو بگاڑ کر پیدا کیے گئے ہیں۔

اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان متفرق طریقوں اور مصنوعی مذہبوں اور انسانی ساخت کے دینوں کی جگہ وہی اصل دین لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اسی کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے اگر تم اُلٹے بگڑتے ہو اور لڑنے کو دَوڑتے ہو تو یہ تمھاری نادانی ہے۔ تمھاری اس حماقت کی وجہ سے نبی اپنا کام نہیں چھوڑ دے گا۔ وہ اس بات پر مامور ہے کہ پوری استقامت کے ساتھ اپنے مَوقِف پر جم جائے اور اُس کام کو پورا کرے جس پر وہ مامور ہوا ہے۔ اُس سے یہ اُمید نہ رکھو کہ وہ تمھیں راضی کرنے کے لیے دین میں اُنھی اَوہام وخُرافات اور جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کے لیے کوئی گنجایش نکالے گا جن سے خدا کا دین پہلے خراب کیا جاتا رہا ہے۔

تم لوگوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دین و آئین کو اختیار کرنا اللہ کے مقابلے میں کتنی بڑی جسارت ہے۔ تم اپنے نزدیک اسے دنیا کا معمول سمجھ رہے ہو، اور تمھیں اس میں کوئی قَباحت نظر نہیں آتی۔ مگر اللہ کے نزدیک یہ بدترین شرک اور شدید ترین جرم ہے، جس کی سخت سزا اُن سب لوگوں کو بھگتنی پڑے گی جنھوں نے اللہ کی زمین پر اپنا دین جاری کیا اور جنھوں نے اُن کے دین کی پیَروی اور اطاعت کی۔

اِس طرح دین کا ایک صاف اور واضح تصور پیش کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم لوگوں کو سمجھا کر راہِ راست پر لانے کے لیے جو بہتر سے بہتر طریقہ ممکن تھا، وہ استعمال کیا جا چکا۔ ایک طرف اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی جو نہایت دل نشین طریقے سے تمھاری اپنی زبان میں تمھیں حقیقت بتا رہی ہے، اور دوسری طرف

QuranUrdu.com

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کی زندگیاں تمھاری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، جنھیں دیکھ کر تم جان سکتے ہو کہ اس کتاب کی رہنمائی میں کیسے انسان تیار ہوتے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم ہدایت نہ پاؤ تو پھر دنیا میں کوئی چیز تمھیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی۔ اس کا نتیجہ تو پھر یہی ہے کہ تمھیں اُسی گمراہی میں پڑا رہنے دیا جائے جس میں تم صدیوں سے مبتلا ہو، اور اُسی انجام سے تم کو دوچار کر دیا جائے جو ایسے گمراہوں کے لیے اللہ کے ہاں مقدّر ہے۔

اِن حقائق کو بیان کرتے ہوئے بیچ بیچ میں اختصار کے ساتھ توحید اور آخرت کے دلائل دیے گئے ہیں، دنیا پرستی کے نتائج پر مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے، آخرت کی سزا سے ڈرایا گیا ہے، اور کفار کی اُن اَخلاقی کمزوریوں پر گرفت کی گئی ہے جو ہِدایت سے اُن کے منہ موڑنے کا اصل سبب تھیں۔ پھر کلام کو ختم کرتے ہوئے دو اہم باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

ایک یا یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی زندگی کے ابتدائی چالیس سال میں ''کتاب'' کے تصوُّر سے بالکل خالی الذہن اور ایمان کے مسائل و مباحث سے قطعی ناواقف رہنا، اور پھر یکایک اِن دونوں چیزوں کو لے کر دنیا کے سامنے آ جانا، آپؐ کے نبی ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

دوسرے، یہ کہ آپؐ کا اپنی پیش کردہ تعلیم کو خدا کی تعلیم قرار دینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپؐ خدا سے رُو در رُو کلام کرنے کے مُدّعی ہیں، بلکہ خدا نے یہ تعلیم تمام انبیاؑ کی طرح آپؐ کو بھی تین طریقوں سے دی ہے: ایک وحی، دوسرے پردے کے پیچھے سے آواز، اور تیسرے فرشتے کے ذریعے سے پیغام۔ یہ وضاحت اس لیے کی گئی کہ مخالفین یہ الزام تراشی نہ کر سکیں کہ حضورؐ خدا سے رُو دَر رُو کلام کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور حق پسند لوگ یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انسان نبوت کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہو، اُسے کن طریقوں سے ہِدایات دی جاتی ہیں۔

QuranUrdu.com

۵۳ آیاتہا

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ

۵ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۴ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ
فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

ح م، ع س ق۔ اسی طرح اللہ غالب و حکیم تمھاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے (رسولوں) کی طرف وحی کرتا رہا ہے[۱]۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اُسی کا ہے، وہ برتر اور عظیم ہے[۲]۔ قریب ہے کہ آسمان اُوپر سے پھٹ پڑیں[۳]۔ فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کر رہے ہیں اور زمین والوں کے حق میں

۱ — افتتاحِ کلام کا یہ انداز خود بتا رہا ہے کہ پَسِ منظر میں وہ چہ می گوئیاں ہیں جو مکۂ معظّمہ کی ہر محفل، ہر چوپال، ہر کوچہ و بازار اور ہر مکان اور دُکان میں اُس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور قرآن کے مضامین پر ہو رہی تھیں۔ لوگ کہتے تھے کہ نہ معلوم یہ شخص کہاں سے یہ نرالی باتیں نکال نکال کر لا رہا ہے۔ ہم نے تو ایسی باتیں نہ کبھی سُنیں، نہ ہوتے دیکھیں۔ وہ کہتے تھے: یہ عجیب ماجرا ہے کہ باپ دادا سے جو دین چلا آ رہا ہے، ساری قوم جس دین کی پیروی کر رہی ہے، سارے ملک میں جو طریقے صدیوں سے رائج ہیں، یہ شخص اِن سب کو غلط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے جو دین مَیں پیش کر رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ وہ کہتے تھے: اِس دین کو بھی اگر یہ اِس حیثیت سے پیش کرتا کہ دینِ آبائی اور رائج الوقت طریقوں میں اِسے کچھ قَباحت نظر آتی ہے اور اُن کی جگہ اِس نے خود کچھ نئی باتیں سوچ کر نکالی ہیں، تو اس پر کچھ گفتگو بھی کی جا سکتی تھی، مگر وہ تو کہتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے جو میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ یہ بات آخر کیسے مان لی جائے؟ کیا خدا اِس کے پاس آتا ہے؟ یا یہ خدا کے پاس جاتا ہے؟ یا اِس کی اور خدا کی بات چیت ہوتی ہے؟ اِنھی چرچوں اور چہ می گوئیوں پر بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے، مگر دراصل کفار کو سناتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ہاں، یہی باتیں اللہ عزیز و حکیم وحی فرما رہا ہے اور یہی مضامین لیے ہوئے اس کی وحی پچھلے تمام انبیاؑ پر نازل ہوتی رہی ہے۔

وحی کے لُغوی معنیٰ ہیں: ”اشارۂ سَرِیع“ اور ”اشارۂ خفی“، یعنی ایسا اشارہ جو سُرعت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ بس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے، باقی کسی اور شخص کو اُس کا پتا نہ چلنے پائے۔ اِس لفظ کو اِصْطِلاحاً اُس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بجلی کی کوَندی کی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جائے۔

QuranUrdu.com

لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵ وَالَّذِيْنَ

درگزر کی درخواستیں کیے جاتے ہیں[۴]۔ آگاہ رہو، حقیقت میں اللہ غفور و رحیم ہی ہے[۵]۔ جن لوگوں نے

ارشادِ الٰہی کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ کے کسی کے پاس آنے یا اس کے پاس کسی کے جانے اور رُوبرو گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہوسکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرما لیتا ہے۔ اسی مضمون کا اعادہ سورت کی آخری آیات میں کیا گیا ہے، اور وہاں اسے زیادہ کھول کر بیان فرمایا گیا ہے۔

پھر یہ جو اُن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ نرالی باتیں ہیں، اس پر ارشاد ہوا ہے کہ یہ نرالی باتیں نہیں ہیں، بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاؑ آئے ہیں، اُن سب کو بھی خدا کی طرف سے یہی کچھ ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔

۲ - یہ تمہیدی فقرے محض اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ارشاد نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ ان کا ہر لفظ اُس پس منظر سے گہرا ربط رکھتا ہے جس میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف جو لوگ چہ می گوئیاں کر رہے تھے، ان کے اعتراضات کی اوّلین بنیاد یہ تھی کہ حضورؐ ان کو توحید کی دعوت دے رہے تھے، اور وہ اس پر کان کھڑے کر کر کے کہتے تھے کہ اگر اکیلا ایک اللہ ہی معبُود، حاجت روا اور شارع ہے تو پھر ہمارے بزرگ کیا ہوئے؟ اس پر فرمایا گیا ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی مِلک ہے۔ مالک کے ساتھ اس کی مِلکیّت میں کسی اور کی خداوندی آخر کس طرح چل سکتی ہے؟ خُصوصاً جب کہ وہ دوسرے، جن کی خداوندی مانی جاتی ہے، یا جو اپنی خداوندی چلانا چاہتے ہیں، خود بھی اُس کے مملوک ہی ہیں۔ پھر فرمایا گیا کہ وہ برتر اور عظیم ہے، یعنی اِس سے بالاتر اور بزرگ تر ہے کہ کوئی اُس کا ہم سر ہو، اور اس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں سے کسی چیز میں بھی حصّہ دار بن سکے۔

۳ - یعنی یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے کہ کسی مخلوق کا نسب خدا سے جا ملایا گیا اور اسے خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دیا گیا۔ کسی کو حاجت روا اور فریاد رس ٹھیرا لیا گیا اور اس سے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ کسی بزرگ کو دنیا بھر کا کارساز سمجھ لیا گیا اور عَلانِیَہ کہا جانے لگا کہ ہمارے حضرت ہر وقت ہر جگہ ہر شخص کی سنتے ہیں اور وہی ہر ایک کی مدد کو پہنچ کر اس کے کام بنایا کرتے ہیں۔ کسی کو اَمر و نہی اور حلال و حرام کا مختار مان لیا گیا اور خدا کو چھوڑ کر لوگ اس کے احکام کی اطاعت اِس طرح کرنے لگے کہ گویا وہی اِن کا خدا ہے۔ خدا کے مقابلے میں یہ وہ جسارتیں ہیں جن پر اگر آسمان پھٹ پڑیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ (یہی مضمون سورۂ مریم، آیات ۸۸-۹۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے۔)

۴ - مطلب یہ ہے کہ فرشتے انسانوں کی یہ باتیں سُن سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ کیا بکواس ہے جو ہمارے رب کی شان میں کی جا رہی ہے، اور یہ کیسی بغاوت ہے جو زمین کی اس مخلوق نے برپا کر رکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: سبحان اللہ! کس کی یہ حیثیت ہوسکتی ہے کہ ربّ العالمین کے ساتھ اُلوہیّت اور حکم میں شریک ہو سکے، اور کون اُس کے سوا ہمارا اور سب بندوں کا محسن ہے کہ اُس کی حمد کے ترانے گائے جائیں اور اس کا شکر ادا کیا جائے۔ پھر وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ایسا جُرمِ عظیم دنیا میں کیا جا رہا ہے

QuranUrdu.com

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝٦ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ

اُس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست[۶] بنا رکھے ہیں، اللہ ہی اُن پر نگراں ہے، تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو۔[۷]

ہاں، اِسی طرح اے نبیؐ! یہ قرآنِ عربی ہم نے تمھاری طرف وحی کیا[۸] ہے، تاکہ تم بستیوں کے مرکز

جس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہر وقت بھڑک سکتا ہے، اس لیے وہ زمین پر بسنے والے اِن خود فراموش وخدا فراموش بندوں کے حق میں بار بار رحم کی درخواست کرتے ہیں کہ ابھی ان پر عذاب نازل نہ کیا جائے اور انھیں سنبھلنے کا کچھ اور موقع دیا جائے۔

۵ - یعنی یہ اُس کی حلیمی ورحیمی اور چشم پوشی ودرگزر ہی تو ہے جس کی بدولت کفر اور شرک اور دَہریّت اور فِسق وفُجور اور ظلم وستم کی انتہا کر دینے والے لوگ بھی سال ہا سال تک، بلکہ اس طرح کے پورے پورے معاشرے صدیوں تک مہلت پر مہلت پاتے چلے جاتے ہیں، اور ان کو صرف رزق ہی نہیں ملے جاتا بلکہ دنیا میں ان کی بڑائی کے ڈنکے بجتے ہیں اور زینتِ حیاتِ دُنیا کے وہ سروسامان انھیں ملتے ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر نادان لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے۔

۶ - اصل میں لفظ ''اَوْلِیَآء'' استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبُودانِ باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں، جن کو قرآنِ مجید میں ''اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآنِ پاک کا تَتَبُّع کرنے سے لفظِ ''ولی'' کے حسبِ ذیل مفہُومات معلوم ہوتے ہیں:

۱- جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے، اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے۔ (النساء، آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰۔ الاعراف: ۳-۲۷ تا ۳۰)

۲- جس کی رہنمائی (guidance) پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غَلَطی سے بچانے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۵۷۔ بنی اسرائیل: ۹۷۔ الکہف: ۱۷-۵۰۔ الجاثیہ: ۱۹)

۳- جس کے متعلق آدمی یہ کہے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے، اور اگر خدا ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے، تو اُس کے عذاب سے بچا لے گا۔ (النساء: ۱۲۳-۱۷۳۔ الانعام: ۵۱۔ الرعد: ۳۷۔ العنکبوت: ۲۲۔ الاحزاب: ۶۵۔ الزمر: ۳)

۴- جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات ومصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں برلاتا ہے، اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔ (ہود: ۲۰۔ الرعد: ۱۶۔ العنکبوت: ۴۱)

بعض مَقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا گیا ہے، اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ

QuranUrdu.com

أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ
فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝۷ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ

(شہرِ مکّہ) اور اُس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو[9]، اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دو[10]، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ کو جنت میں جانا ہے اور دوسرے گروہ کو دوزخ میں۔

اگر اللہ چاہتا تو اِن سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے،

اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں۔ آیتِ زیرِ تشریح بھی انھی میں سے ایک ہے۔ یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورۂ بالا چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی و مددگار سمجھنا ہے۔

۷ – ''اللہ ہی ان پر نگراں ہے''، یعنی وہ ان کے سارے افعال دیکھ رہا ہے اور اُن کے نامۂ اعمال تیار کر رہا ہے۔ ان کا مُحاسبہ اور مُؤاخذہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ ''تم ان کے حوالہ دار نہیں ہو''، یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی قسمت تمھارے حوالے نہیں کر دی گئی ہے کہ جو تمھاری بات نہ مانے گا، اُسے تم جلا کر خاک کر دو گے، یا اُس کا تختہ اُلٹ دو گے، یا اُسے تَہس نَہس کر کے رکھ دو گے۔ اِس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ! نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے تھے، اور آپؐ کی غلط فہمی یا بر خود غلطی کو رفع کرنے کے لیے یہ بات ارشاد ہوئی ہے۔ بلکہ اس سے مقصود کفار کو سنانا ہے۔ اگرچہ بظاہر مخاطَب حضوؐر ہی ہیں، لیکن اصل مُدّعا کفار کو یہ بتانا ہے کہ اللہ کا نبی اُس طرح کا کوئی دعویٰ نہیں رکھتا جیسے بلند بانگ دعوے خدا رسیدگی اور رُوحانیت کے ڈھونگ رچانے والے عُموماً تمھارے ہاں کیا کرتے ہیں۔ جاہلیت کے معاشروں میں بالعُموم یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ''حضرت''، قِسم کے لوگ ہر اُس شخص کی قسمت بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں جو ان کی شان میں کوئی گستاخی کرے۔ بلکہ مر جانے کے بعد اُن کی قبر کی بھی اگر کوئی توہین کر گزرے، یا اور کچھ نہیں تو ان کے متعلق کوئی بُرا خیال ہی دل میں لے آئے تو وہ اس کا تختہ اُلٹ دیتے ہیں۔ یہ خیال زیادہ تر ''حضرتوں'' کا اپنا پھیلایا ہوا ہوتا ہے، اور نیک لوگ جو خود ایسی باتیں نہیں کرتے، اُن کے نام اور ان کی ہڈیوں کو اپنے کاروبار کا سرمایہ بنانے کے لیے کچھ دوسرے ہوشیار لوگ اُن کے متعلق اس خیال کو پھیلاتے ہیں۔ بہر حال عوام میں اِسے روحانیت و خدا رسیدگی کا لازمہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی کو قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ اسی فریب کا طِلسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ کفار کو سناتے ہوئے اپنے رسولِ پاک سے فرما رہا ہے کہ بلاشبہ تم ہمارے پیغمبر ہو اور ہم نے اپنی وحی سے تمھیں سرفراز کیا ہے، مگر تمھارا کام صرف لوگوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔ اُن کی قسمتیں تمھارے حوالے نہیں کر دی گئی ہیں۔ وہ ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہیں۔ بندوں کے اعمال کو دیکھنا اور اُن کو عذاب دینا یا نہ دینا ہمارا اپنا کام ہے۔

۸ – وہی بات پھر دُہرا کر زیادہ زور دیتے ہوئے کہی گئی ہے جو آغازِ کلام میں کہی گئی تھی۔ اور ''قرآنِ عربی'' کہہ کر سامعین

QuranUrdu.com

وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۝۸ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ
اَوْلِیَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِیُّ وَ هُوَ یُحْیِ الْمَوْتٰى ۫ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۹ ع

اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔[11] کیا (یہ ایسے نادان ہیں کہ) اِنھوں نے اُسے چھوڑ کر دوسرے ولی بنا رکھے ہیں؟ ولی تو اللہ ہی ہے، وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔[12] ع

کو مُتَنَبِّہ کیا گیا ہے کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، تمھاری اپنی زبان میں ہے۔ تم براہِ راست اسے خود سمجھ سکتے ہو۔ اس کے مضامین پر غور کر کے دیکھو کہ یہ پاک صاف اور بے غرض رہنمائی کیا خداوندِ عالَم کے سوا کسی اَور کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔

۹ – یعنی انھیں غفلت سے چونکا دو اور مُتَنَبِّہ کر دو کہ افکار و عقائد کی جن گمراہیوں اور اَخلاق و کردار کی جن خرابیوں میں تم لوگ مبتلا ہو، اور تمھاری انفرادی اور قومی زندگی جن فاسد اُصولوں پر چل رہی ہے، ان کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۱۰ – یعنی انھیں یہ بھی بتا دو کہ یہ تباہی و بربادی صرف دنیا ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ آگے وہ دن بھی آنا ہے جب اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جمع کر کے اُن کا حساب لے گا۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنی گمراہی و بدعملی کے بُرے نتائج سے بچ بھی نکلا تو اُس دن بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اور بڑا ہی بدقسمت ہے وہ جو یہاں بھی خراب ہوا اور وہاں بھی اُس کی شامت آئے۔

۱۱ – یہ مضمون اس سلسلۂ کلام میں تین مقاصد کے لیے آیا ہے:

اوّلاً، اس سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم اور تسلّی دینا ہے۔ اس میں حضورؐ کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ آپؐ کُفّارِ مکہ کی جَہالت و ضلالت اور اُوپر سے اُن کی ضد اور ہٹ دھرمی کو دیکھ دیکھ کر اس قدر زیادہ نہ کُڑھیں، اللہ کی مرضی یہی ہے کہ انسانوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی عطا کی جائے، پھر جو ہِدایَت چاہے اسے ہدایت ملے، اور جو گمراہ ہی ہونا پسند کرے اسے جانے دیا جائے جدھر وہ جانا چاہتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی مَصلَحَت نہ ہوتی تو انبیاؑ اور کتابیں بھیجنے کی حاجت ہی کیا تھی، اس کے لیے تو اللہ جَلَّ شانُہٗ کا ایک تخلیقی اشارہ کافی تھا، سارے انسان اُسی طرح مُطیعِ فرمان ہوتے جس طرح دریا، پہاڑ، درخت، مٹی، پتھر اور سب حیوانات ہیں۔ (اِس مقصد کے لیے یہ مضمون دوسرے مقامات پر بھی قرآنِ مجید میں بیان ہوا ہے۔ مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، الاَنعام، حواشی ۲۳ تا ۲۵-۷۱)

ثانیاً، اس کے مخاطَب وہ تمام لوگ ہیں جو اِس ذہنی اُلجھن میں گرفتار تھے اور اب بھی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ فی الواقع انسانوں کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا، اور اگر عقیدہ و عمل کے یہ اختلافات، جو لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اُسے پسند نہ تھے، اور اگر اُسے پسند یہی تھا کہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کریں، تو اس کے لیے آخر وحی اور کتاب اور نبوّت کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو وہ بآسانی اس طرح کر سکتا تھا کہ سب کو مومن و مسلم پیدا کر دیتا۔ اِسی اُلجھن کا ایک شاخسانہ یہ استدلال بھی تھا کہ جب اللہ نے ایسا نہیں کیا ہے تو ضرور وہ مختلف طریقے جن پر ہم چل رہے ہیں، اس کو پسند ہیں، اور ہم جو کچھ کر رہے ہیں اُسی کی مرضی سے کر رہے ہیں، لہٰذا اُس پر اعتراض کا کسی کو حق نہیں ہے۔ (اِس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے بھی یہ مضمون قرآن میں متعدِّد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ مُلاحَظہ ہو:

QuranUrdu.com

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي

تمھارے[۱۳] درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اُس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے[۱۴]۔ وہی اللہ میرا[۱۵]

تفہیم القرآن، جلد اوّل، الانعام، حواشی ۸۰ - ۱۱۰ - ۱۲۴ - ۱۲۵۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ، ۱۰۱، ہود، حاشیہ ۱۱۶، النحل، حواشی ۱۰-۳۱-۳۲)

ثالثاً، اس کا مقصد اہلِ ایمان کو اُن مشکلات کی حقیقت سمجھانا ہے جو تبلیغِ دین اور اصلاحِ خَلق کی راہ میں اکثر پیش آتی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی آزادیِ انتخاب وارادہ، اور اس کی بنا پر طبائع اور طریقوں کے اختلاف کی حقیقت کو نہیں سمجھتے، وہ کبھی تو کارِ اصلاح کی سُست رفتاری دیکھ کر مایوس ہونے لگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ کرامتیں اور معجزات رونما ہوں، تاکہ انھیں دیکھتے ہی لوگوں کے دل بدل جائیں، اور کبھی وہ ضرورت سے زیادہ جوش سے کام لے کر اصلاح کے بے جا طریقے اختیار کرنے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (اِس مقصد کے لیے بھی یہ مضمون بعض مَقامات پر قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے۔ مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرعد، حواشی ۴۷ تا ۴۹، النحل ۸۹ تا ۹۷)

اِن مقاصد کے لیے ایک بڑا اہم مضمون اِن مختصر سے فقروں میں بیان فرمایا گیا ہے۔ دنیا میں اللہ کی حقیقی خلافت اور آخرت میں اس کی جنت کوئی معمولی رحمت نہیں ہے جو مٹی اور پتھر اور گدھوں اور گھوڑوں کے مرتبے کی مخلوق پر ایک رحمتِ عام کی طرح بانٹ دی جائے۔ یہ تو ایک خاص رحمت اور بہت اُونچے درجے کی رحمت ہے، جس کے لیے فرشتوں تک کو موزوں نہ سمجھا گیا۔ اسی لیے انسان کو ایک ذی اختیار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کر کے اللہ نے اپنی زمین کے یہ وسیع ذرائع اُس کے تصرُّف میں دیے، اور یہ ہنگامہ خیز طاقتیں اس کو بخشیں، تاکہ یہ اُس امتحان سے گزر سکے جس میں کامیاب ہو کر ہی کوئی بندہ اُس کی یہ رحمتِ خاص پانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ رحمت اللہ کی اپنی چیز ہے۔ اس پر کسی کا اِجارہ نہیں ہے، نہ کوئی اسے اپنے ذاتی اِستحقاق کی بنا پر دعوے سے لے سکتا ہے، نہ کسی میں یہ طاقت ہے کہ اسے بزور حاصل کر سکے۔ اِسے وہی لے سکتا ہے جو اللہ کے حُضور بندگی پیش کرے، اس کو اپنا ولی بنائے اور اس کا دامن تھامے۔ تب اللہ اس کی مدد اور رہنمائی کرتا ہے، اور اُسے اِس امتحان سے بخیریت گزرنے کی توفیق عطا فرماتا ہے، تاکہ وہ اس کی رحمت میں داخل ہو سکے۔ لیکن جو ظالم اللہ ہی سے منہ موڑ لے اور اس کے بجائے دوسروں کو اپنا ولی بنا بیٹھے، اللہ کو کچھ ضرورت نہیں پڑی ہے کہ خواہ مخواہ زبردستی اس کا ولی بنے، اور دوسرے جن کو وہ ولی بناتا ہے، سرے سے کوئی علم، کوئی طاقت اور کسی قسم کے اختیارات ہی نہیں رکھتے کہ اس کی وِلایت کا حق ادا کر کے اسے کامیاب کرا دیں۔

۱۲ - یعنی وِلایت کوئی من سمجھوتے کی چیز نہیں ہے کہ آپ جسے چاہیں اپنا ولی بنا بیٹھیں، اور وہ حقیقت میں بھی آپ کا سچا اور اصلی ولی بن جائے اور وِلایت کا حق ادا کر دے۔ یہ تو ایک اَمرِ واقعی ہے جو لوگوں کی خواہشات کے ساتھ بنتا اور بدلتا نہیں چلا جاتا، بلکہ جو حقیقت میں ولی ہے وہی ولی ہے، خواہ آپ اسے ولی نہ سمجھیں اور نہ مانیں، اور جو حقیقت میں ولی نہیں ہے وہ ولی نہیں ہے، خواہ آپ مرتے دم تک اسے ولی سمجھتے اور مانتے چلے جائیں۔ اب رہا یہ سوال کہ صرف اللہ ہی کے ولیِ حقیقی ہونے اور دوسرے کسی کے نہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی ولی وہی ہو سکتا ہے جو موت کو حیات میں تبدیل کرتا ہے،

QuranUrdu.com

جس نے بے جان مادّوں میں جان ڈال کر جیتا جاگتا انسان پیدا کیا ہے، اور جو حقِ ولایت ادا کرنے کی قدرت اور اختیارات بھی رکھتا ہے۔ وہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہو تو اسے ولی بناؤ، اور اگر وہ صرف اللہ ہی ہے، تو پھر اس کے سوا کسی اور کو اپنا ولی بنا لینا جَہالت وحماقت اور خودکُشی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۱۳ - اس پورے پیراگراف کی عبارت اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہے، لیکن اس میں متکلّم اللہ تعالیٰ نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ گویا اللہ جَلَّ شانُہٗ اپنے نبی کو ہِدایت دے رہا ہے کہ تم یہ اعلان کرو۔ اس طرح کے مضامین قرآنِ مجید میں کہیں تو قُلْ (اے نبی! کہو) سے شروع ہوتے ہیں، اور کہیں اس کے بغیر ہی شروع ہو جاتے ہیں، صرف اندازِ کلام بتا دیتا ہے کہ یہاں متکلّم اللہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے۔ بلکہ بعض مَقامات پر تو کلام اللہ کا ہوتا ہے اور متکلّم اہلِ ایمان ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ فاتحہ میں ہے، یا متکلم فرشتے ہوتے ہیں، جیسے مثلاً سورۂ مریم، آیت ۶۴-۶۵ میں ہے۔

۱۴ - یہ اللہ تعالیٰ کے مالکِ کائنات اور ولیِ حقیقی ہونے کا فطری اور منطقی تقاضا ہے۔ جب بادشاہی اور وِلایَت اُسی کی ہے تو لامحالہ پھر حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے باہمی تنازُعات واختلافات کا فیصلہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ اس کو جو لوگ صرف آخرت کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، وہ غلطی کرتے ہیں۔ کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ اللہ کی یہ حاکمانہ حیثیت اِس دنیا کے لیے نہیں بلکہ صرف موت کے بعد کی زندگی کے لیے ہے۔ اِسی طرح جو لوگ اِس دنیا میں صرف عقائد اور چند ''مذہبی'' مسائل تک اسے محدود قرار دیتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں۔ قرآنِ مجید کے الفاظ عام ہیں، اور وہ صاف صاف عَلَی الاطلاق تمام نزاعات واختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں۔ ان کی رُو سے اللہ جس طرح آخرت کا مالک یوم الدین ہے، اسی طرح اِس دنیا کا بھی احکم الحاکمین ہے۔ اور جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام ومکروہ کیا، اَخلاق میں بدی وزِشتی کیا ہے اور نیکی وخوبی کیا، معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے، معاشرت اور تمدّن اور سیاست اور معیشت میں کون سے طریقے دُرست ہیں اور کون سے غلط۔ آخر اسی بنیاد پر تو قرآن میں یہ بات اُصولِ قانون کے طور پر ثبت کی گئی ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء: ۵۹) اور وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب: ۳۶) اور اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف: ۳)

پھر جس سِیاق وسَباق میں یہ آیت آئی ہے، اُس کے اندر یہ ایک اور معنیٰ بھی دے رہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اختلافات کا فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ کا محض قانونی حق ہی نہیں ہے، جس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کافر ومومن ہونے کا مدار ہے، بلکہ اللہ فی الواقع عملاً بھی حق اور باطل کا فیصلہ کر رہا ہے، جس کی بدولت باطل اور اس کے پرستار آخرِکار تباہ ہوتے ہیں اور حق اور اس کے پرستار سرفراز کیے جاتے ہیں، خواہ اِس فیصلے کے نفاذ میں دنیا والوں کو کتنی ہی تاخیر ہوتی نظر آتی ہو۔ یہ مضمون آگے آیت ۲۴ میں بھی آ رہا ہے، اور اس سے پہلے قرآنِ مجید میں متعدِّد مَقامات پر گزر چکا ہے۔ (مُلاحَظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، الرَّعد، حواشی ۳۴-۶۰، ابراہیم، حواشی ۲۶-۳۴ تا ۴۰، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۰۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۱۵ تا ۱۸۔ ۴۴ تا ۴۶)

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ⑩ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ
يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ لَهٗ
مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ

رب ہے، اُسی پر میں نے بھروسا کیا، اور اسی کی طرف میں رُجوع کرتا ہوں[16]۔ آسمانوں اور زمین کا بنانے والا، جس نے تمھاری اپنی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے، اور اسی طرح جانوروں میں بھی (انھی کے ہم جنس) جوڑے بنائے، اور اِس طریقے سے وہ تمھاری نسلیں پھیلاتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں[17]، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے[18]۔ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں، جسے چاہتا ہے کھلا رزق

---

۱۵ – یعنی جو اختلافات کا فیصلہ کرنے والا اصل حاکم ہے۔

۱۶ – یہ دو فعل ہیں، جن میں سے ایک بصیغۂ ماضی بیان کیا گیا ہے اور دوسرا بصیغۂ مضارع جس میں اِستمرار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صیغۂ ماضی میں فرمایا: ’’میں نے اُسی پر بھروسا کیا‘‘، یعنی ایک دفعہ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلہ کرلیا کہ جیتے جی مجھے اُسی کی مدد، اُسی کی رہنمائی، اُسی کی حمایت وحفاظت، اور اُسی کے فیصلے پر اعتماد کرنا ہے۔ پھر صیغۂ مضارع میں فرمایا: ’’میں اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں‘‘، یعنی جو معاملہ بھی مجھے اپنی زندگی میں پیش آتا ہے، میں اُس میں اللہ ہی کی طرف رُجوع کیا کرتا ہوں۔ کوئی مصیبت، تکلیف، یا مشکل پیش آتی ہے تو کسی کی طرف نہیں دیکھتا، اُس سے مدد مانگتا ہوں۔ کوئی خطرہ پیش آتا ہے تو اُس کی پناہ ڈھونڈتا ہوں اور اُس کی حفاظت پر بھروسا کرتا ہوں۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو اُس سے رہنمائی طلب کرتا ہوں اور اُسی کی تعلیم وہدایت میں اُس کا حل یا حکم تلاش کرتا ہوں۔ اور کسی سے نزاع ہوتی ہے تو اُسی کی طرف دیکھتا ہوں کہ اُس کا آخری فیصلہ وہی کرے گا، اور یقین رکھتا ہوں کہ جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہی حق ہوگا۔

۱۷ – اصل الفاظ ہیں: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ’’کوئی چیز اُس کے مانند جیسی نہیں ہے۔‘‘ مفسرین اور اہلِ لغت میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس میں لفظِ مثل پر کاف (حرفِ تشبیہ) کا اضافہ محاورے کے طور پر کیا گیا ہے، جس سے مقصود محض بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے، اور عرب میں یہ طرزِ بیان رائج ہے۔ مثلاً شاعر کہتا ہے: وقتلٰی کمثل جذوع النخل۔ اور ایک دوسرا شاعر کہتا ہے: ما ان کمثلھم فی الناس من احد۔ بعض دوسرے حضرات کا قول یہ ہے کہ ’’اس جیسا کوئی نہیں‘‘ کہنے کے بجائے ’’اُس کے مثل جیسا کوئی نہیں‘‘ کہنے میں مبالغہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر بفرضِ محال اللہ کا کوئی مثل ہوتا تو اُس جیسا بھی کوئی نہ ہوتا، کجا کہ خود اللہ جیسا کوئی ہو۔

QuranUrdu.com

وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى
بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ

دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے، اُسے ہر چیز کا علم ہے۔[19]

اُس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوحؑ کو دیا تھا، اور جسے (اے محمدؐ!) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے، اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اِس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اِس دین کو اور اُس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔[20] یہی بات

۱۸ – یعنی بیک وقت ساری کائنات میں ہر ایک کی سُن رہا ہے اور ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔

۱۹ – یہ دلائل ہیں اِس امر کے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کیوں ولیِ برحق ہے، اور کیوں اسی پر توکّل کرنا صحیح ہے، اور کیوں اسی کی طرف رُجوع کیا جانا چاہیے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد سوم، النمل، حواشی ۷۳ تا ۸۳، الروم، حواشی ۲۵ تا ۳۱)

۲۰ – یہاں اُسی بات کو پھر زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو پہلی آیت میں ارشاد ہوئی تھی۔ اِس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں، نہ انبیاؑ میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شروع سے تمام انبیاؑ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسلِ انسانی کے اوّلین پیغمبر تھے، اُس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے جو آخری نبی ہیں، پھر حضرت ابراہیمؑ کا نام لیا گیا ہے جنھیں اہلِ عرب اپنا پیشوا مانتے تھے، اور آخر میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اِنھی پانچ انبیاؑ کو اُس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاؑ بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین لے کر آئے ہیں، اور نمونے کے طور پر اُن پانچ جلیل القدر انبیاؑ کا نام لے دیا گیا ہے جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے:

فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ، ”مقرر کیا تمھارے لیے“۔ شرع کے لغوی معنیٰ راستہ بنانے کے ہیں، اور اِصطِلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عَرَبی زبان میں اسی اِصطلاحی معنیٰ کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی

QuranUrdu.com

(legislation) کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون (law) کا، اور شارع کا لفظ واضعِ قانون (lawgiver) کا ہم معنٰی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریعِ خداوندی دراصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے اُن اُصولی حقائق کا جو اُوپر آیت نمبر ۱، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے، اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے، اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اُسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اُصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے، اس لیے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لیے قانون و ضابطہ بنائے، اور اسی کی یہ ذمہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون وضابطہ دے۔ چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے۔

پھر فرمایا: مِّنَ الدِّیۡنِ، ''از قسمِ دین''۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ''از آئین'' کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے، اس کی نوعیت آئین کی ہے۔ لفظِ ''دین'' کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورۂ زُمَر، حاشیہ نمبر ۳ میں کر چکے ہیں، وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیش نہیں آ سکتی کہ دین کے معنٰی ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اور جب یہ لفظ طریقے کے معنٰی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مطاع مانے۔ اِس بنا پر اللہ کے مقرر کیے ہوئے اِس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سِفارش (recommendation) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لیے اُن کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنٰی بغاوت کے ہیں، اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسٰی علیہم السلام کو دی گئی تھی، اور اُسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اِس تشریع کو براہِ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دوسرے، یہ کہ یہ تشریع ابتدا سے یکساں رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی زمانے میں کسی قوم کے لیے کوئی دین مقرر کیا گیا ہو، اور کسی دوسرے زمانے میں کسی اور قوم کے لیے اُس سے مختلف اور متضاد دین بھیج دیا گیا ہو۔ خدا کی طرف سے بہت سے دین نہیں آئے ہیں، بلکہ جب بھی آیا ہے یہی ایک دین آیا ہے۔ تیسرے، یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ اُن لوگوں کی رسالت کو ماننا، جن کے ذریعے سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے، اور اُس وحی کو تسلیم کرنا جس میں یہ تشریع بیان کی گئی ہے، اِس دین کا لازمی جُز ہے، اور عقل و مَنطِق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو لازمی جز ہونا چاہیے، کیونکہ آدمی اس تشریع کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا جب تک وہ اُس کے خدا کی طرف سے مستند (authentic) ہونے پر مطمئن نہ ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاؑ کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اِس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ۔ اِس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''قائم کنید دین را'' کیا ہے، اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''قائم رکھو دین کو''۔ یہ دونوں ترجمے دُرست ہیں۔ اِقامت کے معنٰی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی، اور انبیا علیہم السلام اِن دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم

QuranUrdu.com

کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اُس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو۔ ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا، پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں: ایک، یہ کہ دین کو قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے، یہ کہ خود دین سے کیا مراد ہے، جسے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اِن دونوں باتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

قائم کرنے کا لفظ جب کسی مادّی یا جسمانی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بیٹھے کو اُٹھانا ہوتا ہے، مثلاً کسی انسان یا جانور کو اُٹھانا۔ یا پڑی ہوئی چیز کو کھڑا کرنا ہوتا ہے، جیسے بانس یا ستون کو قائم کرنا۔ یا کسی چیز کے بکھرے ہوئے اجزا کو جمع کر کے بلند کرنا ہوتا ہے، جیسے کسی خالی زمین میں عمارت قائم کرنا۔ لیکن جو چیزیں مادّی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں، اُن کے لیے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے مراد اُس چیز کی محض تبلیغ کرنا نہیں، بلکہ اس پر کما حقُّہٗ عمل درآمد کرنا، اسے رواج دینا اور اسے عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فُلاں شخص نے اپنی حکومت قائم کی، تو اس کے معنٰی یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت کی طرف دعوت دی، بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا، اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا انتظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں قائم ہیں، تو اس کے معنٰی یہ ہوتے ہیں کہ انصاف کرنے کے لیے منصف مقرر ہیں اور وہ مُقدّمات کی سماعت کر رہے ہیں اور فیصلے دے رہے ہیں، نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں خوب خوب بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب قرآنِ مجید میں حکم دیا جاتا ہے کہ نماز قائم کرو، تو اس سے مراد نماز کی دعوت و تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ نماز کو اُس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہلِ ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ رائج ہو جائے۔ مسجدیں ہوں، جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو، وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں، امام اور خطیب مقرر ہوں، اور لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے۔ اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دِقّت پیش نہیں آ سکتی کہ انبیا علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں، اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کر لیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کر لیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین اُن میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے، تاکہ اس کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اِس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آ سکتا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اِس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے، بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے، مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے، کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاؑ کے مشن کا مقصدِ وحید قرار دے بیٹھے۔

اب دوسرے سوال کو لیجیے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیا علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے، اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا، اس لیے انھوں نے یہ رائے قائم کر لی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں، بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لانا ہے، یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اَخلاقی اُصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں

QuranUrdu.com

مشترک رہے ہیں۔لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کر لی گئی ہے، اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دینِ بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیّدنا مسیح علیہ السلام کی اُمّت کو خراب کر دیا۔اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اِقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اَخلاقی اُصولوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے۔اِس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے، آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اَخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی۔قرآنِ مجید کا جب ہم تَتَبُّع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے، ان میں حسبِ ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔(البیّنہ: آیت ۵) ''اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اور یہی راست رَو ملّت کا دین ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں، حالانکہ اِن دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزا، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اُس کے اوقات، اور یہی اس کے دوسرے احکام رہے ہیں۔اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔لیکن اختلافِ شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ اِن دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ..... اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ..... (المائدہ: ۳) ''تمھارے لیے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُؤر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، اور وہ جو گلا گھُٹ کر، یا چوٹ کھا کر، یا بلندی سے گر کر، یا ٹکّر کھا کر مرا ہو، یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو، سوائے اُس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا، اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔نیز یہ بھی تمھارے لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعے سے اپنی قسمت معلوم کرو۔یہ سب کام فِسق ہیں۔آج کافروں کو تمھارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا.....'' اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (التوبہ: ۲۹) ''جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔'' معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال و حرام

QuranUrdu.com

کے اُن احکام کو ماننا اور اُن کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (النور: ۲) ''زانیہ عورت اور مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو، اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔'' مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف: ۷۶) ''یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔'' اِس سے معلوم ہوا کہ فوج داری قانون بھی دین ہے۔ اگر آدمی خدا کے فوج داری قانون پر چلے تو وہ خدا کے دین کا پیرو ہے، اور اگر بادشاہ کے قانون پر چلے تو وہ بادشاہ کے دین کا پیرو۔

یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنّم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زِنا، سود خواری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عملِ قومِ لُوط، اور لین دین میں قومِ شعیبؑ کا رَوِیّہ) اُن کا سدِّباب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہیے، اس لیے کہ دین اگر جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصّہ ہونے چاہییں جن کی خلاف ورزی کو خلود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے، مثلاً میراث کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ (النساء: ۱۴) ''جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اللہ کے حُدود سے تجاوز کرے گا، اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس کے لیے رُسوا کُن عذاب ہے۔'' اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدّت اور قطعیّت کے ساتھ بیان کی ہے، مثلاً ماں بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حُرمت، چوری کی حُرمت، جُوئے کی حُرمت، جھوٹی شہادت کی حُرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیے ہیں جن کا اِجرا مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، اُن کی اِقامت کو بھی محض اس بہانے اِقامت دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے، اور کعبے کا حج تو صرف اُس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

دراصل ساری غَلَط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ آیت لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (ہم نے تم میں سے ہر اُمّت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی) کا اُلٹا مطلب لے کر اسے یہ معنٰی پہنا دیے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر اُمت کے لیے الگ تھی، اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیا کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اِقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مَقام پر یہ آیت آئی ہے، اُس کے پورے سِیاق وسَباق کو آیت ۴۱ سے آیت ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی اُمت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اُس اُمّت کے لیے دین تھی اور اُس کے دَورِ نبوت میں اُسی کی اِقامت مطلوب تھی۔

QuranUrdu.com

اوراب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دَورِ نبوت ہے، اس لیے اُمّتِ محمدؐیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اِس دَور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ رہا ان شریعتوں کا اختلاف، تو اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے، مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا، اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزا میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا، مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اِس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اِقامتِ دین میں شامل ہے، مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی اُمت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے، اُنھی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا، اور اب اقامت دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لیے شریعتِ محمدؐیہ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے، اس کے مطابق انھیں ادا کیا جائے۔ انھی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

قرآنِ مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا، اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیّت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ عَلانِیَہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دینِ حق کو فکری، اَخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان لڑا دیں، اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصّے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء:۱۰۵) ''اے نبیؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو اللہ نے تمھیں دکھائی ہے۔'' اِس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیے گئے ہیں، وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وُصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمّہ لے۔ (التوبہ:۶۰-۱۰۳) اِس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۵-۲۷۹) وہ اُسی صورت میں رُوبہ عمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور مَعاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اِس کتاب میں قاتل سے قِصاص لینے کا حکم (البقرہ، ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ:۳۸)، زِنا اور قَذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور: ۲-۴) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ اِن احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قِتال کا حکم (البقرہ:۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پَیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اِس کتاب میں اہلِ کتاب سے جِزیہ لینے کا حکم (التوبہ:۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے اُن سے جِزیہ وصول کریں گے اور اُن کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ صرف مَدَنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے، مکّی سورتوں میں بھی دِیدۂ بینا کو عَلانِیَہ یہ نظر آ سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا، نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے

QuranUrdu.com

ذِمّی بن کر رہنے کا۔ مثال کے طور پر مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حواشی ۸۹-۹۹-۱۰۱۔ جلد سوم، القصص، ۱۰۴-۱۰۵، الروم، ۱ تا ۳۔ جلد چہارم، الصّافّات، آیات ۱۷۱ تا ۱۷۹ (حواشی ۹۳-۹۴)، صٓ، دیباچہ اور آیت ۱۱ مع حاشیہ ۱۲۔

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مُسَخَّر کیا، اور اُس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اَخلاق، تہذیب وتمدُّن، معیشت ومعاشرت، سیاست وعدالت اور صلح وجنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضورؐ کے اس پورے کام کو ''اقامتِ دین'' کے اُس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیاؑ سمیت آپؐ کو دیا گیا تھا، تو پھر اس کے دو ہی معنٰی ہو سکتے ہیں: یا تو معاذ اللہ! حضورؐ پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپؐ مامور تو صرف ایمانیات اور اَخلاق کے موٹے موٹے اُصولوں کی محض تبلیغ ودعوت پر ہوئے تھے، مگر آپؐ نے اس سے تجاوز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصل قانون بنا ڈالا، جو شرائعِ انبیاؑ کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالیٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شُوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا، اور اس نے اپنے آخری نبی سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورت کی اعلان کردہ ''اقامتِ دین'' سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا، بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا)، اعاذنا اللہ من ذالک۔ ان دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے ''اِقامتِ دین'' کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اُس کے رسولؐ پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوتا ہو تو ہم ضرور اُسے معلوم کرنا چاہیں گے۔

اِقامتِ دین کا حکم دینے کے بعد، آخری بات جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ''دین میں تفرِقہ نہ برپا کرو''، یا ''اس کے اندر متفرق نہ ہو جاؤ''۔ دین میں تَفرِقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجایش اُس میں نہ ہو، اور اصرار کرے کہ اس کی نکالی ہوئی بات کے ماننے ہی پر کفر وایمان کا مدار ہے، پھر جو ماننے والے ہوں انھیں لے کر نہ ماننے والوں سے جدا ہو جائے۔ یہ نرالی بات کئی طرح کی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو چیز نہ تھی وہ اس میں لا کر شامل کر دی جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین میں جو بات شامل تھی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی نُصوص میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلات کر کے نرالے عقائد اور انوکھے اعمال ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دین کی باتوں میں ردّوبدل کر کے اس کا حلیہ بگاڑا جائے، مثلاً جو چیز اہم تھی اسے غیر اہم بنا دیا جائے، اور جو چیز حد سے حدِ مباح کے درجے میں تھی اسے فرض وواجب، بلکہ اس سے بھی بڑھا کر اسلام کا رکنِ رَکین بنا ڈالا جائے۔ اسی طرح کی حرکتوں سے انبیا علیہم السلام کی اُمتوں میں پہلے تَفرِقہ برپا ہوا، پھر رفتہ رفتہ ان فرقوں کے مذاہب بالکل الگ مستقل ادیان بن گئے جن کے ماننے والوں میں اب یہ تصور تک باقی نہیں رہا ہے کہ کبھی ان سب کی اصل ایک تھی۔ اِس تَفرِقے کا اُس جائز اور معقول اختلافِ رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور نصوص پر غور کر کے اُن سے مسائل مُستَنبَط کرنے میں فطری طور پر اہلِ علم کے درمیان واقع ہوتا ہے، اور جس کے لیے خود کتاب اللہ کے الفاظ میں لغت اور محاورے اور قواعدِ زبان کے لحاظ سے گنجایش

QuranUrdu.com

عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ
وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ

اِن مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ!) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کرلیتا ہے، اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُسی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رُجوع کرے[21]۔
لوگوں میں جو تفرِقہ رُونما ہوا، وہ اِس کے بعد ہوا کہ اُن کے پاس علم آچکا تھا[22]، اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے[23]۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک

ہوتی ہے۔ (اس موضوع پر مزید تفصیلی بحث کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۲۲۰، آلِ عمران، حواشی ۱۶-۱۷، النساء، ۲۱۱ تا ۲۱۶، المائدہ، ۱۰۱، الانعام، ۱۴۱۔ جلد دوم، النحل، حواشی ۱۱۷ تا ۱۲۱۔ جلد سوم، الانبیاء، حواشی ۸۹ تا ۹۱، الحج، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۷، المومنون، ۴۵ تا ۴۸، القصص، ۴۷ تا ۴۷، الروم، ۵۰-۵۱)

۲۱ – یہاں پھر وہی بات دُہرائی گئی ہے جو اس سے پہلے آیت ۸-۹ میں ارشاد ہو چکی ہے اور جس کی تشریح ہم حاشیہ نمبر ۱۱ میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ یہ بات ارشاد فرمانے کا مدّعا یہ ہے کہ تم اِن لوگوں کے سامنے دین کی صاف شاہراہ پیش کر رہے ہو، اور یہ نادان اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اُلٹے اس پر بگڑ رہے ہیں۔ مگر انھی کے درمیان انھی کی قوم میں وہ لوگ موجود ہیں جو اللہ کی طرف رُجوع کر رہے ہیں، اور اللہ بھی انھیں کھینچ کھینچ کر اپنی طرف لا رہا ہے۔ اب یہ اپنی اپنی قسمت ہے کہ کوئی اِس نعمت کو پائے اور کوئی اس پر خار کھائے۔ مگر اللہ کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ اُسی کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو اس کی طرف بڑھے۔ دُور بھاگنے والوں کے پیچھے دَوڑنا اللہ کا کام نہیں ہے۔

۲۲ – یعنی تَفرِقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں، اِس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذہب اور مدارسِ فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تَفرِقہ اُن میں اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد رُونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمّہ دار نہیں ہے، بلکہ وہ لوگ خود اُس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے دین کے صاف صاف اُصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

۲۳ – یعنی اِس تَفرِقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپَج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضِدّم ضِدّا، ایک دوسرے کو زَک دینے کی کوشش، اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہوگا جس کے آگے لوگ جھکیں گے، ایک رسول ہوگا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہوگی جس کی طرف لوگ رُجوع کریں گے، اور

QuranUrdu.com

اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ
مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ

وقتِ مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چُکا دیا گیا ہوتا۔[24] اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے، وہ اُس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔[25]

چونکہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے، اس لیے اے محمدؐ! اب تم اُسی دین کی طرف دعوت دو، اور

ایک صاف عقیدہ اور بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں اُن کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقامِ امتیاز نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے ان کی مَشِیخَت چلے، اور لوگ اُن کے گرد جمع ہوں، اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادات اور مذہبی مراسم، اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرّک بنا، اور اسی نے خلقِ خدا کے ایک بڑے حصّے کو دین کی صاف شاہراہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی اِن گروہوں کی باہمی بحث وجدال اور مذہبی ومعاشی اور سیاسی کشمکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت اُن خوں ریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخِ انسانی سُرخ ہو رہی ہے۔

۲۴ – یعنی دنیا ہی میں عذاب دے کر ان سب لوگوں کا خاتمہ کر دیا جاتا جو گمراہیاں نکالنے اور جان بوجھ کر ان کی پیروی کرنے کے مجرم تھے، اور صرف راہِ راست پر چلنے والے باقی رکھے جاتے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ خدا کے نزدیک حق پر کون ہیں اور باطل پر کون۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دوٹوک فیصلہ قیامت تک کے لیے ملتوی کر رکھا ہے، کیونکہ دنیا میں یہ فیصلہ کر دینے کے بعد بنی نوعِ انسان کی آزمایش بے معنیٰ ہو جاتی ہے۔

۲۵ – مطلب یہ ہے کہ ہر نبی اور اُس کے قریبی تابعین کا دور گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انھوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شکوک اور ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا ہوگئیں۔ اس حالت میں اُن کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وُجوہ تھے، جنھیں ہم اُس صورتِ حال کا مُطالعہ کر کے بآسانی سمجھ سکتے ہیں جو توراۃ وانجیل کے معاملے میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو اگلی نسلوں نے اُن کی اصل حالت پر اُن کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا۔ اُن میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر و تاریخ اور سَماعی رِوایات اور فُقَہا کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کلام گڈمڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو اتنا رواج دیا کہ اصل غائب ہوگئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اس کے ہاتھ میں ہے، وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے سے دنیا والوں کو ملی تھی۔ پھر ان کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الٰہیات، فلسفہ، قانون،

QuranUrdu.com

اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ
رَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ

جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اُس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ، اور اِن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو[۲۶]، اور ان سے کہہ دو کہ: ”اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا[۲۷]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں[۲۸]۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے[۲۹]۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں[۳۰]۔

طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظامِ فکر بنا ڈالے جن کی بُھول بُھلیّوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابلِ اعتماد صورت میں موجود نہ تھی، اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رُجوع بھی نہ کر سکتے تھے جو حق کو باطل سے مُمیّز کرنے میں ان کی مدد کرتی۔

۲۶ - یعنی ان کو راضی کرنے کے لیے اِس دین کے اندر کوئی ردّ و بدل اور کمی بیشی نہ کرو۔ ”کچھ لو اور کچھ دو“ کے اُصول پر اِن گمراہ لوگوں سے کوئی مُصالحت نہ کرو۔ اِن کے اَوہام اور تعصّبات اور جاہلانہ طور طریقوں کے لیے دین میں کوئی گنجایش محض اِس لالچ میں آ کر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح یہ دائرۂ اسلام میں آ جائیں۔ جس کو ماننا ہے، خدا کے اصلی اور خالص دین کو، جیسا کہ اس نے بھیجا ہے، سیدھی طرح مان لے، ورنہ جس جہنم میں جا کر گرنا چاہے گر جائے۔ خدا کا دین لوگوں کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا۔ لوگ اگر اپنی فلاح چاہتے ہیں تو خود اپنے آپ کو بدل کر اس کے مطابق بنائیں۔

۲۷ - بالفاظِ دیگر، مَیں اُن تَفرِقَہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اُس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے۔

۲۸ - اِس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں:

ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصّب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے سراسر عدل و انصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو۔ اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے، میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمھارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں، اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں

QuranUrdu.com

اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ وَ الَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ عَلَيْهِمْ

اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اُسی کی طرف سب کو جانا ہے۔"

اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں[۳۱]، اُن کی حُجّت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے، اور اُن پر

ہے، بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حُقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لیے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے، اور جو جُرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اِس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی اِستثنا نہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سُپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں، اور اُن بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کر دوں جو تمھاری زندگیوں میں اور تمھارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔

ان تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکّۂ معظّمہ میں نہ کُھلا تھا، مگر ہجرت کے بعد کھل گیا، اور وہ یہ ہے کہ میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں، تمھارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔

۲۹ – یعنی ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے عمل کا خود ذمہ دار و جواب دِہ ہے۔ تم اگر نیکی کرو گے تو اس کا پھل ہمیں نہیں پہنچ جائے گا، بلکہ تم ہی اس سے مُتمتّع ہو گے۔ اور ہم اگر بُرائی کریں گے تو اس کی پاداش میں تم نہیں پکڑے جاؤ گے، بلکہ ہمیں خود ہی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یہی بات سورۂ بقرہ، آیت ۱۳۹، سورۂ یُونس، آیت ۴۱، سورۂ ہود، آیت ۳۵، اور سورۂ قصص، آیت ۵۵ میں اس سے پہلے ارشاد ہو چکی ہے۔ (مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۲۹۔ جلد دوم، یونُس، حاشیہ ۴۹، ہود، حاشیہ ۳۹، القصص، حاشیہ ۷۷)

۳۰ – یعنی معقول دلائل سے بات سمجھانے کا جو حق تھا، وہ ہم نے ادا کر دیا۔ اب خواہ مخواہ تُو تُو مَیں مَیں کرنے سے کیا حاصل؟ تم اگر جھگڑا کرو بھی تو ہم تم سے جھگڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

۳۱ – یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکّے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے، مدّتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اسے چَین لینے دیا جاتا نہ محلّے اور برادری میں، جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی، جس کا مدّعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اسی جاہلیت میں پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

QuranUrdu.com

غَضَبٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴿١٦﴾ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ﴿١٧﴾ يَسْتَعْجِلُ بِهَا
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ
يَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ
ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ﴿١٨﴾ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ

اس کا غضب ہے اور اُن کے لیے سخت عذاب ہے۔

وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب اور میزان نازل کی ہے[۳۲]۔ اور تمھیں کیا خبر، شاید کہ فیصلے کی گھڑی قریب ہی آ لگی ہو[۳۳]۔ جو لوگ اس کے آنے پر ایمان نہیں رکھتے وہ تو اس کے لیے جلدی مچاتے ہیں، مگر جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یقیناً وہ آنے والی ہے۔ خوب سُن لو، جو لوگ اُس گھڑی کے آنے میں شک ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں، وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے[۳۴]۔ جسے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے[۳۵]، اور وہ بڑی قوت والا

۳۲- میزان سے مراد اللہ کی شریعت ہے، جو ترازو کی طرح تول کر صحیح اور غلط، حق اور باطل، ظلم اور عدل، راستی اور ناراستی کا فرق واضح کر دیتی ہے۔ اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا تھا کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں۔) یہاں بتا دیا گیا کہ اِس کتابِ پاک کے ساتھ وہ میزان آ گئی ہے جس کے ذریعے سے یہ انصاف قائم کیا جائے گا۔

۳۳- یعنی جس کو سیدھا ہونا ہے بلا تاخیر سیدھا ہو جائے۔ فیصلے کی گھڑی کو دُور سمجھ کر ٹالنا نہیں چاہیے۔ ایک سانس کے متعلق بھی آدمی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کے بعد دوسرے سانس کی اُسے مُہلت ضرور ہی مل جائے گی۔ ہر سانس آخری سانس ہو سکتا ہے۔

۳۴- اصل میں لفظ لَطِيْفٌ استعمال ہوا ہے، جس کا پورا مفہوم ''مہربان'' سے ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ میں دو مفہوم شامل ہیں: ایک، یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت و عنایت رکھتا ہے۔ دوسرے، یہ کہ وہ بڑی باریک بینی کے ساتھ

QuranUrdu.com

الْعَزِيْزُ ﴿۱۹﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ

اور زبردست ہے۔[۳۶] ع جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اُس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اُس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔[۳۷]

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنھوں نے اِن کے لیے دین کی نوعیّت رکھنے والا ایک ایسا

اُن کی دَقیق ترین ضروریات پر بھی نگاہ رکھتا ہے جن تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی، اور انھیں اس طرح پورا کرتا ہے کہ وہ خود بھی محسوس نہیں کرتے کہ ہماری کون سی ضرورت کب کس نے پوری کر دی۔ پھر یہاں بندوں سے مراد محض اہلِ ایمان نہیں، بلکہ تمام بندے ہیں، یعنی اللہ کا یہ لطف اس کے سب بندوں پر عام ہے۔

۳۵ - مطلب یہ ہے کہ اِس لطفِ عام کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ سب بندوں کو سب کچھ یکساں دے دیا جائے۔ اگرچہ وہ اپنے خزانوں سے دے سب ہی کو رہا ہے، مگر اس عطا اور دین میں یکسانی نہیں ہے۔ کسی کو کوئی چیز دی ہے، تو کسی دوسرے کو کوئی اور چیز۔ کسی کو ایک چیز زیادہ دی ہے، تو کسی اور کو کوئی دوسری چیز فراوانی کے ساتھ عطا فرما دی ہے۔

۳۶ - یعنی اس کی عطا و بخشش کا یہ نظام اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ کسی کا یہ بَل بُوتا نہیں ہے کہ اسے بدل سکے، یا زبردستی اس سے کچھ لے سکے، یا کسی کو دینے سے اس کو روک سکے۔

۳۷ - گزشتہ آیت میں دو حقیقتیں بیان کی گئی تھیں جن کا مُشاہَدہ ہم ہر وقت ہر طرف کر رہے ہیں۔ ایک، یہ کہ تمام بندوں پر اللہ کا لُطف عام ہے۔ دوسرے، یہ کہ اس کی عطا و بخشش اور رزق رسانی سب کے لیے یکساں نہیں ہے، بلکہ اُس میں فرق و تفاوُت پایا جاتا ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس لُطف اور رزق رسانی میں جُزوی تفاوُت تو بے شمار ہیں، مگر ایک بہت بڑا اُصولی تفاوُت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آخرت کے طالب کے لیے ایک طرح کا رزق ہے، اور دنیا کے طالب کے لیے دوسری طرح کا رزق۔

یہ ایک بڑی اہم حقیقت ہے جسے اِن مختصر الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اسے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھ لیا جائے، کیونکہ یہ ہر انسان کو اپنا رَوِیّہ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔

آخرت اور دنیا دونوں کے لیے سعی و عمل کرنے والوں کو اس آیت میں کسان سے تشبیہ دی گئی ہے جو زمین تیار کرنے سے لے کر فصل کے تیار ہونے تک مسلسل عرق ریزی اور جاں فشانی کرتا ہے، اور یہ ساری محنتیں اس غرض کے لیے کرتا ہے کہ اپنی کھیتی میں جو بیج وہ بو رہا ہے اس کی فصل کاٹے اور اس کے پھل سے مُتَمَتّع ہو۔ لیکن نیت اور مقصد کے فرق، اور بہت بڑی حد تک طرزِ عمل کے فرق سے

QuranUrdu.com

يَأۡذَنۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ ؕ

طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے اِذن نہیں دیا؟[۳۸] اگر فیصلے کی بات پہلے طے نہ ہو گئی ہوتی تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا

بھی، آخرت کی کھیتی بونے والے کسان اور دنیا کی کھیتی بونے والے کسان کے درمیان فرقِ عظیم واقع ہو جاتا ہے، اس لیے دونوں کی محنتوں کے نتائج وثمرات بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف رکھے ہیں' حالانکہ دونوں کے کام کرنے کی جگہ یہی زمین ہے۔

آخرت کی کھیتی بونے والے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ دنیا اسے نہیں ملے گی۔ دنیا تو کم یا زیادہ بہر حال اس کو ملنی ہی ہے، کیونکہ یہاں اللہ جَلَّ شانُہٗ کے لُطفِ عام میں اس کا بھی حصّہ ہے، اور رزق نیک و بد سبھی کو یہاں مل رہا ہے۔ لیکن اللہ نے اُسے خوشخبری دنیا ملنے کی نہیں بلکہ اس بات کی سنائی ہے کہ اس کی آخرت کی کھیتی بڑھائی جائے گی، کیونکہ اُسی کا وہ طالب ہے اور اُسی کے انجام کی اُسے فکر لاحق ہے۔ اس کھیتی کے بڑھائے جانے کی بہت سی صورتیں ہیں۔ مثلاً جس قدر زیادہ نیک نیتی کے ساتھ وہ آخرت کے لیے عملِ صالح کرتا جائے گا، اُسے اور زیادہ نیک عمل کی توفیق عطا کی جائے گی اور اس کا سینہ نیکیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پاک مقصد کے لیے پاک ذرائع اختیار کرنے کا جب وہ تہیہ کر لے گا تو اس کے لیے پاک ہی ذرائع میں برکت دی جائے گی، اور اللہ اس کی نوبت نہ آنے دے گا کہ اس کے لیے خیر کے سارے دروازے بند ہو کر صرف شر ہی کے دروازے کھلے رہ جائیں۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا میں اس کی تھوڑی نیکی بھی آخرت میں کم از کم دس گُنی تو بڑھائی ہی جائے گی، اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، ہزاروں لاکھوں گُنی بھی اللہ جس کے لیے چاہے گا بڑھا دے گا۔

رہا دنیا کی کھیتی بونے والا، یعنی وہ شخص جو آخرت نہیں چاہتا اور سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے اس کی محنت کے دو نتائج صاف صاف سنا دیے ہیں: ایک، یہ کہ خواہ وہ کتنا ہی سر مارے، جس قدر دنیا وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ پوری کی پوری اسے نہیں مل جائے گی، بلکہ اس کا ایک حصّہ ہی ملے گا، جتنا اللہ نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ دوسرے، یہ کہ اسے جو کچھ ملنا ہے بس دنیا ہی میں مل جائے گا، آخرت کی بھلائیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۸- اس آیت میں شُرَکَآءُ سے مراد، ظاہر بات ہے کہ وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، یا جن کے آگے پُوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں۔ بلکہ لامحالہ اُن سے مراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے جن کے سکھائے ہوئے افکار وعقائد اور نظریّات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اَخلاقی اُصولوں اور تہذیب وثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور ضابطوں کو اپنے مذہبی مراسم اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدّن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں میں، اور اپنی سیاست اور حکومت میں اِس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی ان کو کرنی چاہیے۔ یہ ایک پورا کا پورا دین ہے جو اللہ ربّ العالَمین کی تشریع کے خلاف اور اس کے اِذن (sanction) کے بغیر ایجاد کرنے والوں نے ایجاد کیا اور ماننے والوں نے مان لیا۔ اور یہ ویسا ہی شرک ہے جیسا غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور غیر اللہ سے دعائیں مانگنا شرک ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حواشی ۱۷۰-۲۸۶،

QuranUrdu.com

وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِیْنَ مُشْفِقِیْنَ
مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فِیْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِیْ یُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا
الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِیْهَا حُسْنًا ؕ

ہوتا۔ یقیناً اِن ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم اُس وقت اپنے کیے کے انجام سے ڈر رہے ہوں گے اور وہ اِن پر آ کر رہے گا۔ بخلاف اِس کے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں، وہ جنّت کے گلستانوں میں ہوں گے، جو کچھ بھی وہ چاہیں گے اپنے رب کے ہاں پائیں گے، یہی بڑا فضل ہے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی خوشخبری اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جنھوں نے مان لیا اور نیک عمل کیے۔ اَے نبیؐ! اِن لوگوں سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں[۴۰]، البتہ قرابت کی مَحبّت ضرور چاہتا ہوں[۴۱]۔ جو کوئی بھلائی کمائے گا، ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوبی کا اضافہ کر دیں گے۔

آلِ عمران، حاشیہ ۵۷، النساء، حاشیہ ۹۰، المائدہ، حواشی ۱ تا ۵ - ۱۰۴-۱۰۵، الاَنعام، حواشی ۸۶-۸۷-۱۰۶-۱۰۷۔ جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱، یونُس، حواشی ۶۰-۶۱، ابراہیم، حواشی ۳۰ تا ۳۲، النحل، حواشی ۱۱۴ تا ۱۱۶۔ جلد سوم، الکہف، حواشی ۴۹-۵۰، مریم، حاشیہ ۲۷، القصص، حاشیہ ۸۶۔ جلد چہارم، سبا، آیت ۴۱، حاشیہ ۶۳، یٰسین، آیت ۶۰، حاشیہ ۵۳)

۳۹ - یعنی اللہ کے مقابلے میں یہ ایسی سخت جسارت ہے کہ اگر فیصلہ قیامت پر نہ اُٹھا رکھا گیا ہوتا تو دنیا ہی میں ہر اُس شخص پر عذاب نازل کر دیا جاتا جس نے اللہ کا بندہ ہوتے ہوئے، اللہ کی زمین پر خود اپنا دین جاری کیا، اور وہ سب لوگ بھی تباہ کر دیے جاتے جنھوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ کر دوسروں کے بنائے ہوئے دین کو قبول کیا۔

۴۰ - ''اس کام'' سے مراد وہ کوشش ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خدا کے عذاب سے بچانے اور جنت کی بشارت کا مستحق بنانے کے لیے کر رہے تھے۔

QuranUrdu.com

۴۱ – اصل الفاظ ہیں: اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔ یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر ”قُربیٰ“ کی محبّت ضرور چاہتا ہوں۔ اس لفظ ”قُربیٰ“ کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے۔

ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنیٰ میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ”میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا تو لحاظ کرو جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو۔“ یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالے سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمِذی، ابنِ جَرِیر، طَبَرانی، بَیہَقی اور ابنِ سَعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مُجاہد، عِکرِمَہ، قَتادہ، سُدِّی، ابو مالک، عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، ضَحّاک، عطا بن دینار اور دوسرے اکابر مفسرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ ”قُربیٰ“ کو قُرب اور تقرُّب کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ”میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اِس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمھارے اندر اللہ کے قُرب کی چاہت پیدا ہو جائے“، یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حَسَن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قَتادہؒ سے بھی اِس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طَبَرانی کی ایک رِوایَت میں ابنِ عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآنِ مجید میں ایک دوسرے مَقام پر یہی مضمون اِن الفاظ میں ارشاد ہوا ہے: قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان: ۵۷) ”اِن سے کہہ دو کہ میں اِس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔“

تیسرا گروہ ”قُربیٰ“ کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنیٰ میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ ”میں تم سے اِس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبّت کرو۔“ پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمُطّلِب مراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبَیرؒ اور عَمرو بن شُعَیبؒ سے منقول ہے، اور بعض رِوایات میں یہی تفسیر ابنِ عباسؓ اور حضرت علیؒ بن حسینؒ (زین العابدینؒ) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدِد وُجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکۂ معظّمہ میں سورۂ شُوریٰ نازل ہوئی ہے، اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمُطّلِب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کُھلّم کُھلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمُطّلِب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدۂ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ حضرت خدیجہؓ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اَقرِبا میں سے آپؐ صرف بنی عبدالمُطّلِب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس مطالبۂ محبّت کو انھی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو اِن سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مَقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مَقام سے اِس کارِ عظیم پر

QuranUrdu.com

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ
اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ

بے شک اللہ بڑا درگزر کرنے والا اور قدر دان ہے۔[۴۲]
کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس شخص نے اللہ پر جھوٹا بُہتان گھڑ لیا ہے[۴۳]؟ اگر اللہ چاہے تو تمھارے
دل پر مُہر کر دے[۴۴]۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے[۴۵]۔ وہ

یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآنِ مجید میں انبیا علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں، اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ ربّ العالمین کے ذمّے ہے۔ (یونس، ۷۲۔ ہود، ۲۹-۵۱۔ الشعراء، ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰) سورۂ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے۔ (آیت ۲۱) خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآنِ پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ (الانعام: ۹۰۔ یوسف: ۱۰۴۔ المومنون: ۷۲۔ الفرقان: ۵۷۔ سبا: ۴۷۔ ص: ۸۶۔ الطّور: ۴۰۔ القلم: ۴۶) اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں، اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرو۔ پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تقریر کے مخاطَب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اُوپر سے ساری تقریر اُنھی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی رُوئے سُخن انھی کی طرف ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپؐ ان سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمھاری انجام دی ہے، اس پر تم میرے رشتہ داروں سے مَحبّت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اِسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپؐ کی جان کے درپے تھے۔

۴۲ - یعنی جان بُوجھ کر نافرمانی کرنے والے مجرمین کے برعکس، نیکی کی کوشش کرنے والے بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ (۱) جتنی کچھ اپنی طرف سے وہ نیک بننے کی سعی کرتے ہیں، اللہ ان کو اس سے زیادہ نیک بنا دیتا ہے۔ (۲) ان کے کام میں جو کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، یا نیک بننے کی کوشش کے باوجود جو گناہ ان سے سرزد ہو جاتے ہیں، اللہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے، اور (۳) جو تھوڑی سی نیک عمل کی پونجی وہ لے کر آتے ہیں، اللہ اس پر ان کی قدر افزائی کرتا ہے اور انھیں زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔

۴۳ - اِس سوالیہ فقرے میں سخت ملامت کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ! کیا یہ لوگ اس قدر جری اور بے باک ہیں کہ تم جیسے شخص پر افترا، اور وہ بھی اِفْتِرا عَلَی اللہ جیسے گھناؤنے فعل کا الزام رکھتے ہوئے انھیں ذرا شرم نہیں آتی؟ یہ تم پر تہمت لگاتے ہیں کہ تم اس قرآن کو خود تصنیف کر کے جھوٹ مُوٹ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو؟

QuranUrdu.com

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ
وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ

سینوں کے چھُپے ہوئے راز جانتا ہے[۴۶]۔ وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور بُرائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اُسے علم ہے[۴۷]۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دُعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اَور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے،

۴۴ – یعنی اتنے بڑے جھوٹ صرف وہی لوگ بولا کرتے ہیں جن کے دلوں پر مُہر لگی ہوئی ہے۔ اگر اللہ چاہے تو تمھیں بھی اُن میں شامل کر دے۔ مگر اُس کا یہ فضل ہے کہ اُس نے تمھیں اِس گروہ سے الگ رکھا ہے۔ اس جواب میں اُن لوگوں پر شدید طنز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام رکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اَے نبیؐ! ان لوگوں نے تمھیں بھی اپنی قُماش کا آدمی سمجھ لیا ہے۔ جس طرح یہ خود اپنی اغراض کے لیے ہر بڑے سے بڑا جھوٹ بول جاتے ہیں، اِنھوں نے خیال کیا کہ تم بھی اُسی طرح اپنی دکان چمکانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لائے ہو۔ لیکن یہ اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمھارے دل پر وہ مُہر نہیں لگائی ہے جو اِن کے دلوں پر لگا رکھی ہے۔

۴۵ – یعنی یہ اللہ کی عادت ہے کہ وہ باطل کو کبھی پائداری نہیں بخشتا، اور آخرِ کار حق کو حق ہی کر کے دکھا دیتا ہے، اس لیے اَے نبیؐ! تم اِن جھوٹے الزامات کی ذرّہ برابر پروانہ کرو، اور اپنا کام کیے جاؤ۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ سارا جھوٹ غبار کی طرح اُڑ جائے گا، اور جس چیز کو تم پیش کر رہے ہو، اس کا حق ہونا عیاں ہو جائے گا۔

۴۶ – یعنی اُس کو معلوم ہے کہ یہ الزامات تم پر کیوں لگائے جا رہے ہیں، اور یہ ساری تگ ودَو جو تمھیں زَک دینے کے لیے کی جا رہی ہے، اس کے پیچھے درحقیقت کیا اغراض اور کیا نیتیں کام کر رہی ہیں۔

۴۷ – پچھلی آیت کے معاً بعد توبہ کی ترغیب دینے سے خود بخود یہ مضمون نکلتا ہے کہ ظالمو! سچّے نبی پر یہ جھوٹے الزامات رکھ کر کیوں اپنے آپ کو اَور زیادہ خدا کے عذاب کا مستحق بناتے ہو، اب بھی اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ اور توبہ کر لو تو اللہ معاف فرما دے گا۔ توبہ کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس بُرائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اس سے باز آجائے، اور آیندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز یہ بھی سچّی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو بُرائی کسی شخص نے پہلے کی ہے، اُس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کر کے اُس دھبّے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگا لیا ہے۔ لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی بُرے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف ہی میں نہیں آتا۔

QuranUrdu.com

لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي
الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ
بَصِيْرٌ ﴿٢٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ
رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾ ع

توان کے لیے دردناک سزا ہے۔

اگر اللہ اپنے سب بندوں کو کُھلا رزق دے دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کا طوفان برپا کر دیتے، مگر وہ ایک حساب سے جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور اُن پر نگاہ رکھتا ہے[۴۸]۔ وہی ہے جو لوگوں کے مایوس ہو جانے کے بعد مینہ برساتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے، اور وہی قابلِ تعریف ولی ہے[۴۹]۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جان دار مخلوقات جو اُس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں[۵۰]۔ وہ جب چاہے انھیں اکٹھا کر سکتا ہے[۵۱]۔ ع

۴۸ – جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد ہوئی ہے اُسے نظر میں رکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دراصل اللہ تعالیٰ اُس بنیادی سبب کی طرف اشارہ فرما رہا ہے جو کفارِ مکّہ کی سرکشی میں کام کر رہا تھا۔ اگرچہ روم و ایران کے مقابلے میں ان کی کوئی ہستی نہ تھی اور گرد و پیش کی قوموں میں وہ ایک پس ماندہ قوم کے ایک تجارت پیشہ قبیلے، یا بالفاظِ دیگر، بنجاروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، مگر اپنی اس ذرا سی دنیا میں ان کو دوسرے عربوں کی بہ نسبت جو خوش حالی اور بڑائی نصیب تھی، اُس نے اُن کو اتنا مغرور و متکبر بنا دیا تھا کہ وہ اللہ کے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ تھے، اور ان کے سردارانِ قبائل اِس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پیشوا ہوں اور وہ ان کی پیروی کریں۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ اگر کہیں ہم اِن چھوٹے ظرف کے لوگوں پر واقعی رزق کے دروازے کھول دیتے تو یہ بالکل ہی پھٹ پڑتے، مگر ہم نے انھیں دیکھ کر ہی رکھا ہے، اور ناپ تول کر ہم انھیں بس اُتنا ہی دے رہے ہیں جو اِن کو آپے سے باہر نہ ہونے دے۔ اس معنی کے لحاظ سے یہ آیت دوسرے الفاظ میں وہی مضمون ادا کر رہی ہے جو سورۂ توبہ، آیات ۶۸-۷۰، الکہف، آیات ۳۲-۴۲۔ القصص، آیات ۷۵-۸۲۔ الروم، آیت ۹۔ سبا، آیات ۳۴-۳۶۔ اور المومن، آیات ۸۲-۸۵ میں بیان ہوا ہے۔

۴۹ – یہاں ولی سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنی پیدا کردہ ساری مخلوق کے معاملات کی متولّی ہے، جس نے بندوں کی

QuranUrdu.com

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ
كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾
اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے، تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے، اور بہت سے قصُوروں سے وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے[۵۲]۔ تم زمین میں اپنے خدا کو عاجز کر دینے والے نہیں ہو، اور اللہ کے مقابلے میں تم کوئی حامی و ناصر نہیں رکھتے۔ اُس کی نشانیوں میں سے ہیں یہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ اللہ جب چاہے ہوا کو ساکن کر دے اور یہ سمندر کی پیٹھ پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں ــــــ اِس میں

حاجات وضروریات پوری کرنے کا ذمّہ لے رکھا ہے۔

۵۰ - یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کُھلا اشارہ ہے اِس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیّاروں میں بھی جان دار مخلوقات موجود ہیں۔

۵۱ - یعنی جس طرح وہ انھیں پھیلا دینے پر قادر ہے، اُسی طرح وہ انھیں جمع کر لینے پر بھی قادر ہے، لہٰذا یہ خیال کرنا غلط ہے کہ قیامت نہیں آ سکتی اور تمام اوّلین و آخرین کو بیک وقت اُٹھا کر اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ - واضح رہے کہ یہاں تمام انسانی مصائب کی وجہ بیان نہیں کی جا رہی ہے، بلکہ رُوئے سُخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو اس وقت مکّۂ معظّمہ میں کفر و نافرمانی کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تمھارے سارے قصوروں پر گرفت کرتا تو تمھیں جیتا ہی نہ چھوڑتا، لیکن یہ مصائب جو تم پر نازل ہوئے ہیں (غالباً اشارہ ہے مکّہ کے قحط کی طرف) یہ محض بطورِ تنبیہ ہیں، تاکہ تم ہوش میں آؤ، اور اپنے اعمال کا جائزہ لے کر دیکھو کہ اپنے رب کے مقابلے میں تم نے کیا رَوِش اختیار کر رکھی ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جس خدا سے تم بغاوت کر رہے ہو، اس کے مقابلے میں تم کتنے بے بس ہو، اور یہ جانو کہ جنھیں تم اپنا ولی و کارساز بنائے بیٹھے ہو، یا جن طاقتوں پر تم نے بھروسا کر رکھا ہے، وہ اللہ کی پکڑ سے بچانے میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتیں۔

مزید توضیح کے لیے یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ جہاں تک مومنِ مخلص کا تعلق ہے، اُس کے لیے اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔ اُس پر جو تکلیفیں بھی آتی ہیں وہ سب اُس کے گناہوں اور خطاؤں اور کوتاہیوں کا کفّارہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ حدیثِ صحیح میں ہے کہ مَا يُصيبُ المُسلمَ مِنْ نَصَبٍ ولا وَصَبٍ ولا همٍّ ولاحزن ولا اذًى ولاغمٍّ حتى الشوكة يُشاكُها اِلا كفّر اللّٰه بها من خطاياه۔ (بخاری و مسلم) ”مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے،

QuranUrdu.com

لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ یَعْفُ عَنْ
كَثِیْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ یَعْلَمَ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ
مَّحِیْصٍ ﴿۳۵﴾ فَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ مَا

بڑی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو کمال درجہ صبر و شکر کرنے والا ہو[۵۳] ـــــ یا (اُن پر سوار ہونے والوں کے) بہت سے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے ان کے چند ہی کرتوتوں کی پاداش میں انھیں ڈبو دے، اور اُس وقت ہماری آیات میں جھگڑے کرنے والوں کو پتا چل جائے کہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔[۵۴]

جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے،[۵۵] اور جو کچھ

حتّٰی کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چُبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفّارہ بنا دیتا ہے۔" رہے وہ مصائب جو اللہ کی راہ میں اُس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کوئی مومن برداشت کرتا ہے، تو وہ محض کوتاہیوں کا کفّارہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے ہاں ترقّیِ دَرَجات کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور کرنے کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ وہ گناہوں کی سزا کے طور پر نازل ہوتے ہیں۔

۵۳ - "صبر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور اچھے اور بُرے تمام حالات میں بندگی کے رَوِیّے پر ثابت قدم رہے۔ جس کا حال یہ نہ ہو کہ اچھا وقت آئے تو اپنی ہستی کو بُھول کر خدا سے باغی اور بندوں کے حق میں ظالم بن جائے، اور بُرا وقت آ جائے تو دل چھوڑ بیٹھے اور ہر ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے پر اُتر آئے۔ "شکر کرنے والے" سے مراد وہ شخص ہے جسے تقدیرِ الٰہی خواہ کتنا ہی اونچا اُٹھا لے جائے، وہ اسے اپنا کمال نہیں بلکہ اللہ کا احسان ہی سمجھتا رہے، اور وہ خواہ کتنا ہی نیچے گرا دیا جائے، اس کی نگاہ اپنی محرومیوں کے بجائے اُن نعمتوں پر ہی مرکوز رہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی آدمی کو حاصل رہتی ہیں، اور خوش حالی و بدحالی، دونوں حالتوں میں اس کی زبان اور اس کے دل سے اپنے رب کا شکر ہی ادا ہوتا رہے۔

۵۴ - قریش کے لوگوں کو اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں حَبَش اور افریقا کے ساحلی علاقوں کی طرف بھی جانا ہوتا تھا، اور ان سفروں میں وہ بادبانی جہازوں اور کشتیوں پر بحرِ اَحمر سے گزرتے تھے، جو ایک بڑا خطرناک سمندر ہے۔ اس میں اکثر طوفان اُٹھتے رہتے ہیں، اور زیرِ آب چٹانیں کثرت سے ہیں جن سے طوفان کی حالت میں ٹکرا جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس کیفیت کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے یہاں کھینچا ہے، اسے قریش کے لوگ اپنے ذاتی تجرِبات کی روشنی میں پوری طرح محسوس کر سکتے تھے۔

۵۵ - یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی پُھول جائے۔ بڑی سے بڑی دولت بھی جو دنیا میں کسی شخص کو ملی ہے، ایک تھوڑی سی مدّت ہی کے لیے ملی ہے۔ چند سال وہ اُس کو برت لیتا ہے اور پھر سب کچھ چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو جاتا

QuranUrdu.com

عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ ج
وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ
يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ ج وَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۪ وَ اَمْرُهُمْ

اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔[۵۶] وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں،[۵۷] جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں[۵۸] اور اگر غصّہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں،[۵۹] جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں،[۶۰] نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے

ہے۔ پھر وہ دولت بھی چاہے بہی کھاتوں میں کتنی ہی بڑی ہو، عملاً اس کا ایک قلیل سا حصّہ ہی آدمی کے اپنے استعمال میں آتا ہے۔ اس مال پر اِترانا کسی ایسے انسان کا کام نہیں ہے جو اپنی اور اس مال و دولت کی، اور خود اِس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہو۔

۵۶ - یعنی وہ دولت اپنی نوعیت و کیفیت کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہے، اور پھر وقتی و عارضی بھی نہیں ہے، بلکہ اَبَدی اور لازَوال ہے۔

۵۷ - اللہ پر توکّل کو یہاں ایمان لانے کا لازمی تقاضا، اور آخرت کی کامیابی کے لیے ایک ضروری وصف قرار دیا گیا ہے۔ توکُّل کے معنیٰ یہ ہیں کہ: اوّلاً، آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی پر کامل اعتماد ہو اور وہ یہ سمجھے کہ حقیقت کا جو علم، اَخلاق کے جو اُصول، حلال و حرام کے جو حُدُود، اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط اللہ نے دیے ہیں، وہی برحق ہیں اور انھی کی پیروی میں انسان کی خیر ہے۔ ثانیاً، آدمی کا بھروسا اپنی طاقت، قابلیت، اپنے ذرائع و وسائل، اپنی تدابیر، اور اللہ کے سوا دوسروں کی امداد و اعانت پر نہ ہو، بلکہ وہ پوری طرح یہ بات ذہن نشین رکھے کہ دنیا اور آخرت کے ہر معاملے میں اُس کی کامیابی کا اصل انحصار اللہ کی توفیق و تائید پر ہے، اور اللہ کی توفیق و تائید کا وہ اسی صورت میں مستحق ہو سکتا ہے، جب کہ وہ اُس کی رضا کو مقصود بنا کر، اُس کے مقرر کیے ہوئے حُدود کی پابندی کرتے ہوئے کام کرے۔ ثالثاً، آدمی کو اُن وعدوں پر پورا بھروسا ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایمان و عملِ صالح کا رَوِیّہ اختیار کرنے والے اور باطل کے بجائے حق کے لیے کام کرنے والے بندوں سے کیے ہیں، اور انھی وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے وہ اُن تمام فوائد اور منافع اور لذائذ کو لات مار دے جو باطل کی راہ پر جانے کی صورت میں اسے حاصل ہوتے نظر آتے ہوں، اور اُن سارے نقصانات اور تکلیفوں اور محرومیوں کو انگیز کر جائے جو حق پر استقامت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں آئیں۔ توکُّل کے معنیٰ کی اِس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان کے ساتھ اس کا کتنا گہرا تعلق ہے، اور اُس کے بغیر جو ایمان محض خالی خُولی اعتراف و اقرار کی حد تک ہو، اُس سے وہ شاندار نتائج کیوں نہیں حاصل ہو سکتے جن کا وعدہ ایمان لا کر توکُّل کرنے والوں سے کیا گیا ہے۔

۵۸ - تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۵۳ - ۵۴، الاَنعام، حواشی ۱۳۰ - ۱۳۱۔ جلد دوم، النحل، حاشیہ ۸۹، نیز سورۂ نجم، آیت ۳۲۔

QuranUrdu.com

شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۪ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ ۚ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ

سے چلاتے ہیں[۶۱]، ہم نے جو کچھ بھی رزق انھیں دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[۶۲]، اور جب ان پر زیادتی

۵۹ — یعنی وہ غُصَیل اور جھلّے نہیں ہوتے، بلکہ نرم خُو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، ان کی سرِشت انتقامی نہیں ہوتی، بلکہ وہ بندگانِ خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں، اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو اُسے پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے، جسے قرآنِ مجید میں نہایت قابلِ تعریف قرار دیا گیا ہے۔ (آلِ عمران، آیت ۱۳۴) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں شمار کیا گیا ہے۔ (آلِ عمران: ۱۵۹) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ ما انتقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہٖ فی شئ قطّ الا ان تنتهك حرمة اللّٰہِ۔ (بخاری و مسلم) ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا۔ البتہ جب اللہ کی حُرمتوں میں سے کسی حرمت کی ہتک کی جاتی، تب آپؐ سزا دیتے تھے۔“

۶۰ — لفظی ترجمہ ہوگا: ”اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتے ہیں“، یعنی جس کام کے لیے بھی اللہ بلاتا ہے اس کے لیے دَوڑ پڑتے ہیں، اور جس چیز کی بھی اللہ دعوت دیتا ہے اسے قبول کرتے ہیں۔

۶۱ — اِس چیز کو یہاں اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آلِ عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس بنا پر مشاورت اسلامی طرزِ زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیّت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اِس کے وُجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں:

ایک، یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اُس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو، اُس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو اُن کے مُعتَمَدٌ عَلَیہ نمایندوں کو شریکِ مشورہ کیا جائے۔

دوسرے، یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اَخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حُقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہے، اور نہ وہ متکبّر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقلِ کُل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے، یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو، اُن میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دِہی اُسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی

QuranUrdu.com

اِس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس طرح کی جرأتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی باز پُرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو، اُن سب کو، یا اُن کے بھروسے کے نمایندوں کو اُس کا فیصلہ کرنے میں شریکِ مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا جا سکے، اور اگر نادانستہ کوئی غَلَطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمے داری نہ آپڑے۔

یہ تین وُجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ سکتی ہے کہ اسلام جس اَخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اُس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بداَخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرزِ زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اُصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں، اور بچے جب جوان ہوجائیں تو انھیں بھی شریکِ مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو اُن میں کُنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا بَرادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریکِ مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی مُتَّفَق عَلَیہ طریقے کے مطابق تمام متعلق لوگوں کے مُعْتَمَدْ عَلَیہ نمایندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو اُن کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحبِ رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابلِ اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اُسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کرسکتا، نہ یہ فریب کاری کرسکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلّط ہوجائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنی پسند کے نمایندے نہیں بلکہ وہ نمایندے منتخب کریں جو اُس کی مرضی کے مطابق رائے دینے والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اُس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے مُلَوَّث ہو، اور اس خواہش کے ساتھ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کردینے کی کوششیں صرف وہی شخص کرسکتا ہے جسے خدا اور خَلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو، حالانکہ نہ خدا دھوکا کھا سکتا ہے، اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں عَلانِیَہ ڈاکا مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکا نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انھیں اظہارِ رائے کی پوری آزادی حاصل ہو، اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں، اور انھیں اس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غَلَطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں، احتجاج کرسکیں، اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کرکے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر اور ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

QuranUrdu.com

دوم، یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اسے لوگوں کی رضا مندی سے مقرر کیا جائے، اور یہ رضا مندی ان کی آزادانہ رضا مندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی، یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی، یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضا مندی درحقیقت رضا مندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم، یہ کہ سربراہِ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو، اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر، یا مال سے خرید کر، یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر، یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمایندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم، یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں، اور اس طرح کے اظہارِ رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر، یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت خیانت اور غدّاری ہوگی، نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم، یہ کہ جو مشورہ اہلِ شُوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے، یا جسے اُن کے جُمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولا سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ ''ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے''، بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ ''ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں''۔ اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اِجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اُصولِ شُوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شُوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مُطْلَقُ الْعِنان اور مختارِ کل نہیں ہے بلکہ لازماً اُس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے، اور اِس اصل الاُصول کی پابند ہے کہ ''تمھارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے''، اور ''تمھارے درمیان جو نِزاع بھی ہو، اس میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رُجوع کرو'' اس قاعدہ کُلِّیّہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اِس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے، اور اُس پر عمل درآمد کس طریقے سے کیا جائے، تاکہ اُس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو، لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کر دیا ہو، اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

۶۲ - اس کے تین مطلب ہیں:

ایک، یہ کہ جو رزقِ حلال ہم نے انھیں دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مالِ حرام پر ہاتھ نہیں مارتے۔

دوسرے، یہ کہ ہمارے دیے ہوئے رزق کو سینت کر نہیں رکھتے، بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔

QuranUrdu.com

الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ
اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَلَمَنِ

کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں[۶۳] ــــ بُرائی[۶۴] کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے[۶۵]، پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے، اُس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے[۶۶]، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا[۶۷]۔ اور جو لوگ

تیسرے، یہ کہ جو رزق انھیں دیا گیا ہے اُس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ہی ذات کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔

پہلے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف رزقِ حلال وطیّب ہی کو "اپنے دیے ہوئے رزق" سے تعبیر فرماتا ہے، ناپاک اور حرام طریقوں سے کمائے ہوئے رزق کو وہ اپنا رزق نہیں کہتا۔ دوسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رزق انسان کو دیتا ہے وہ خرچ کرنے کے لیے دیتا ہے، سَینت سَینت کر رکھنے اور اس پر مارزر بن کر بیٹھ جانے کے لیے نہیں دیتا۔ اور تیسرے مطلب کی بنیاد یہ ہے کہ خرچ کرنے سے مراد قرآنِ مجید میں محض اپنی ذات پر اور اپنی ضروریات پر ہی خرچ کر دینا نہیں ہے، بلکہ اس کے مفہوم میں اِنفاق فی سبیل اللہ بھی شامل ہے۔ انھی تین وُجوہ سے اللہ تعالیٰ خرچ کرنے کو یہاں اہلِ ایمان کی اُن بہترین صفات میں شمار فرما رہا ہے جن کی بنا پر آخرت کی بھلائیاں انھی کے لیے مختص کی گئی ہیں۔

۶۳ - یہ بھی اہلِ ایمان کی بہترین صفات میں سے ہے۔ وہ ظالموں اور جبّاروں کے لیے نرم چارا نہیں ہوتے۔ اُن کی نرم خوئی اور عَفْو و درگزر کی عادت کمزوری کی بنا پر نہیں ہوتی۔ انھیں بھِکْشُوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کر دیں، جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں، اور جب کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں، لیکن جب کوئی طاقت ور اپنی طاقت کے زَعم میں اُن پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جائیں اور اس کے دانت کھٹے کر دیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور متکبّر کے آگے نہیں جُھکتا۔ اِس قسم کے لوگوں کے لیے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے، جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لیتا ہے۔

۶۴ - یہاں سے آخر پیراگراف تک کی پوری عبارت آیتِ مَاسَبَقَ کی تشریح کے طور پر ہے۔

۶۵ - یہ پہلا اُصولی قاعدہ ہے جسے بدلہ لینے میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو، اتنی ہی بُرائی وہ اس کے ساتھ کر لے، اُس سے زیادہ بُرائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

۶۶ - یہ دوسرا قاعدہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو، وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمے ہے، کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے

QuranUrdu.com

انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ
عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ
عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ ع وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

ع ۱۴ ۵

ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں، اُن کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دُوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے، تو یہ بڑی اُولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔[۶۸] ع

جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے، اُس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔[۶۹]

لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

۶۷ - اس تنبیہ میں بدلہ لینے کے متعلق ایک تیسرے قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک بُرائی کے بدلے میں اُس سے بڑھ کر بُرائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات گھونسوں کی اُس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا دُرست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اُس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینے انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زِنا کرے۔

۶۸ - واضح رہے کہ ان آیات میں اہلِ ایمان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، وہ اُس وقت عملاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں میں موجود تھیں، اور کفارِ مکہ اپنی آنکھوں سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دراصل کفار کو یہ بتایا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی بسر کرنے کا جو سروسامان پا کر تم آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو، اصل دولت وہ نہیں ہے، بلکہ اصل دولت یہ اَخلاق اور اوصاف ہیں جو قرآن کی رہنمائی قبول کر کے تمھارے ہی معاشرے کے ان مومنوں نے اپنے اندر پیدا کیے ہیں۔

۶۹ - مطلب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن جیسی بہترین کتاب اِن لوگوں کی ہِدایت کے لیے بھیجی جو نہایت معقول اور نہایت مؤثّر و دل نشین طریقے سے ان کو حقیقت کا علم دے رہی ہے اور زندگی کا صحیح راستہ بتا رہی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی ان کی رہنمائی کے لیے بھیجا، جس سے بہتر سیرت و کردار کا آدمی کبھی ان کی نگاہوں نے نہ دیکھا تھا۔ اور اِس کتاب اور

QuranUrdu.com

وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ
مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ
يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ
الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ
يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ ﴿۴۶﴾

تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے: اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟[۷۰] اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلّت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے، اور اُس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔[۷۱] اُس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنھوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلّقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو، ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں۔ جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے، اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔

اس رسول کی تعلیم و تربیت کے نتائج بھی اللہ نے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں انھیں آنکھوں سے دکھا دیے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہدایت سے منہ موڑتا ہے تو اللہ پھر اُسی گمراہی میں اسے پھینک دیتا ہے جس سے نکلنے کا وہ خواہش مند نہیں ہے۔ اور جب اللہ ہی نے اسے اپنے دروازے سے دھتکار دیا تو اب کون یہ ذمّہ لے سکتا ہے کہ اسے راہِ راست پر لے آئے گا۔

۷۰ - یعنی آج جب کہ پلٹ آنے کا موقع ہے، یہ پلٹنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کل جب فیصلہ ہو چکے گا اور سزا کا حکم نافذ ہو جائے گا، اس وقت اپنی شامت دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اب انھیں پلٹنے کا موقع ملے۔

۷۱ - انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہولناک منظر اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ جان رہا ہوتا ہے کہ عنقریب وہ اُس بلا کے چنگُل میں آنے والا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہے، تو پہلے تو ڈر کے مارے وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ پھر اس سے رہا نہیں جاتا۔ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بلا کیسی ہے اور ابھی اُس سے کتنی دُور ہے۔ لیکن اِس کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ سر اُٹھا کر نگاہ بھر کر اسے دیکھے۔ اس لیے وہ بار بار ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

QuranUrdu.com

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ
اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا
الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

مان لو اپنے رب کی بات، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے[۷۲]۔ اُس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اور نہ کوئی تمھارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا[۷۳]۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ! ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۷۴]۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمّہ داری ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اُس پر پھُول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر اُلٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے[۷۵]۔

جہنّم کی طرف جانے والوں کی اسی کیفیت کا نقشہ اِس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

۷۲ - یعنی نہ اللہ خود اُسے ٹالے گا اور نہ کسی دوسرے میں یہ طاقت ہے کہ اسے ٹال سکے۔

۷۳ - اصل الفاظ ہیں: مَالَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ۔ اس فقرے کے کئی مفہوم اور بھی ہیں: ایک، یہ کہ تم اپنے کرتوتوں میں سے کسی کا انکار نہ کر سکو گے۔ دوسرے، یہ کہ تم بھیس بدل کر کہیں چھُپ نہ سکو گے۔ تیسرے، یہ کہ تمھارے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا اُس پر تم کوئی احتجاج اور اظہارِ ناراضی نہ کر سکو گے۔ چوتھے، یہ کہ تمھارے بس میں نہ ہو گا کہ جس حالت میں تم مبتلا کیے گئے ہو اسے بدل سکو۔

۷۴ - یعنی تمھارے اُوپر یہ ذمّہ داری تو نہیں ڈالی گئی ہے کہ تم اِنھیں ضرور راہِ راست ہی پر لا کے رہو، اور نہ اس بات کی تم سے کوئی باز پُرس ہونی ہے کہ یہ لوگ کیوں راہِ راست پر نہ آئے۔

۷۵ - انسان سے مراد یہاں وہ چھچھورے اور کم ظرف لوگ ہیں جن کا اُوپر سے ذکر چلا آ رہا ہے۔ جنھیں دنیا کا کچھ رزق مل گیا ہے تو اُس پر پھُولے نہیں سماتے، اور سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو سُن کر نہیں دیتے۔ لیکن اگر کسی وقت اپنے ہی کرتوتوں کی بدولت اُن کی شامت آجاتی ہے تو قسمت کو رونا شروع کر دیتے ہیں اور اُن ساری نعمتوں کو بھول

QuranUrdu.com

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ
يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ
ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ﴿۵۰﴾

اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے[۷۶]، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں مِلا جُلا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے[۷۷]۔

جاتے ہیں جو اللہ نے اُنھیں دی ہیں اور کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جس حالت میں وہ مبتلا ہوئے ہیں اُس میں اُن کا اپنا کیا قصور ہے۔ اِس طرح نہ خوشحالی اُن کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہے، نہ بدحالی ہی انھیں سبق دے کر راہِ راست پر لا سکتی ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ اُن لوگوں کے رویّے پر طنز ہے جو اُوپر کی تقریر کے مخاطب تھے۔ مگر اُن کو خطاب کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ تمھارا حال یہ ہے، بلکہ بات یوں کہی گئی کہ انسان میں عام طور پر یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور یہی اُس کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اِس سے حکمتِ تبلیغ کا یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ مخاطَب کی کمزوریوں پر براہِ راست چوٹ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ عُمومی انداز میں اُن کا ذکر کرنا چاہیے، تاکہ وہ چِڑ نہ جائے، اور اُس کے ضمیر میں اگر کچھ بھی زندگی باقی ہے تو ٹھنڈے دل سے اپنے عیب کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

۷۶ - یعنی کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں، وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں، حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں اور جبّاروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی ہے، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوی اور دیوتا کا اس میں کوئی حصّہ ہے، بلکہ اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بَل بُوتے پر جیت سکتا ہے، نہ اُن ہستیوں میں سے کوئی آ کر اسے بچا سکتی ہے جنھیں لوگوں نے اپنی حماقت سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔

۷۷ - یہ اللہ کی بادشاہی کے مُطلَق (absolute) ہونے کا ایک کُھلا ہُوا ثبوت ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے خدا نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا، جسے خدا نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے خدا نے لڑکے ہی لڑکے دیے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اِس معاملے میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدا کی خدائی میں مختارِ کل ہونے کا زَعم کرے، یا کسی دوسری ہستی کو

QuranUrdu.com

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ
حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ

کسی[۷۸] بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رُوبرُو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے[۷۹]، یا پردے کے پیچھے سے[۸۰]، یا پھر وہ کوئی پیغام بَر (فرشتہ) بھیجتا ہے، اور وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے[۸۱]، وہ برتر اور حکیم ہے[۸۲]۔ اور اِسی طرح (اے محمدؐ!) ہم نے اپنے حکم سے ایک رُوح تمھاری طرف

اختیارات میں دخیل سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے، جس کا خمیازہ وہ خود بُھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی تغیُّر واقع نہیں ہوتا۔

۷۸- تقریر ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کو پھر لیا گیا ہے جو آغازِ کلام میں ارشاد ہوا تھا۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس سورہ کی پہلی آیت اور اس کے حاشیے پر دوبارہ ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

۷۹- یہاں وحی سے مراد ہے اِلقا، الہام، دل میں کوئی بات ڈال دینا، یا خواب میں کچھ دکھا دینا، جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا۔ (یوسف، آیات ۴-۱۰۰۔ الصّافّات، ۱۰۲)

۸۰- مراد یہ ہے کہ بندہ ایک آواز سنے، مگر بولنے والا اُسے نظر نہ آئے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا کہ طور کے دامن میں ایک درخت سے یکایک انھیں آواز آنی شروع ہوئی، مگر بولنے والا ان کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ (طٰہٰ، آیات ۱۱ تا ۴۸۔ النمل، آیات ۸ تا ۱۲۔ القصص، آیات ۳۰ تا ۳۵)

۸۱- یہ وحی کے آنے کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے سے تمام کُتُبِ آسمانی انبیا علیہم السلام تک پہنچی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنیٰ پہنائے ہیں کہ ”اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچاتا ہے۔“ لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (پھر وہ وحی کرتا ہے اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے) اُن کی اس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاؑ کی تبلیغ کو ”وحی کرنے“ سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عَرَبی زبان میں انسان کی انسان سے عَلانِیَہ گفتگو کو ”وحی“ کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجایش ہے۔ لغت میں وحی کے معنیٰ ہی خفیہ اور سَریع اشارے کے ہیں۔ انبیاؑ کی تبلیغ پر اِس لفظ کا اِطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔

۸۲- یعنی وہ اس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کسی بشر سے رُودَررُو کلام کرے، اور اس کی حکمت اِس سے عاجز نہیں ہے کہ اپنے کسی بندے تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لیے رُوبرو بات چیت کرنے کے سوا کوئی اور تدبیر نکال لے۔

QuranUrdu.com

مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا
نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِیْمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا
فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾ ع ۵ ۱۰ ۶

وحی کی ہے[۸۳]۔ تمھیں کچھ پتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے[۸۴]، مگر اُس رُوح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا، جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو! سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رُجوع کرتے ہیں[۸۵]۔ ع

۸۳ - ''اِسی طرح'' سے مراد محض آخری طریقہ نہیں ہے، بلکہ وہ تینوں طریقے ہیں جو اُوپر کی آیات میں مذکور ہوئے ہیں، اور ''رُوح'' سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعے سے حضورؐ کو دی گئی۔ یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن تینوں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں:

(۱) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا ہی سچّے خوابوں سے ہوئی تھی۔ (بخاری و مسلم) یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے۔ چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مُطّلع کیا گیا ہے، اور قرآنِ مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ (الفتح، آیت ۲۷) اس کے علاوہ متعدّد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: فُلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اور احادیثِ قُدسیہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(۲) معراج کے موقع پر حضورؐ کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مُشَرَّف فرمایا گیا۔ متعدّد صحیح احادیث میں حضورؐ کو پنج وقتہ نماز کا حکم دیے جانے، اور حضورؐ کے اُس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے، اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ اور اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ویسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا دامنِ طور میں حضرت موسیٰؑ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

(۳) رہی تیسری قسم، تو اُس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اُسے جبریلِ امین کے ذریعے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا ہے۔ (البقرہ: ۹۷۔ الشعراء: ۱۹۲ تا ۱۹۵)

QuranUrdu.com

۸۴ - یعنی نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضورؐ کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپؐ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے، یا ملنی چاہیے، بلکہ آپؐ سرے سے کُتُبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اِسی طرح آپؐ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپؐ نہ شُعوری طور پر اس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہییں، اور نہ آپؐ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کُتُبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفّارِ مکہ سے بھی چُھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکۂ معظّمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضورؐ کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سنا ہو، یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فُلاں فُلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہوسکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں، اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انھی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد ۳، حاشیہ ۱۰۹ سورۃ القصص)

۸۵ - یہ آخری تنبیہ ہے جو کفار کو دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے کہا اور تم نے سُن کر ردّ کر دیا، اِس پر بات ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے حُضور پیش ہونا ہے، اور آخرِ کار اُسی کے دربار سے یہ فیصلہ ہونا ہے کہ کس کا کیا انجام ہونا چاہیے۔